Regd. L. No. 7243

Phone, 8080

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1970

سرمایہ داروں کو وارننگ

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت کی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سیشن میں قائد اعظم کا خطبہ)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

سالانہ	پاکستان	دس روپے
سالانہ	ہندوستان	پندرہ روپے
سالانہ	غیر ممالک	ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ——— ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی، گلبرگ، لاہور

جلد (۲۳) | جنوری سنہ ۱۹۷۰ء | نمبر (۱)

فہرست

۱. لمعات ——— ۲

۲. پیامِ عید ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹

۳. بزمِ مذاکرہ - (طلوعِ اسلام کنونشن) ——— ۳۳

۴. عہد جدید کا وارث ——— (چوہدری عطاء اللہ صاحب) ——— ۵۷

۵. طلوعِ اسلام کالج ——— (سیکرٹری ٹرانک ایجوکیشن سوسائٹی) ——— ۶۴

۶. اسے کیا کہیے ——— (ابوالحسن نعمی صاحب) ——— ۶۵

۷. ملزم کا بیان ——— ۶۹

۸. قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟ ——— ۷۱

۹. نقد و نظر ——— ۷۳

ایڈیٹر - محمد خلیل۔ ناشر - سراج الحق۔ مقامِ اشاعت - ۲۵ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر - شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ - اشرف پریس ایبک روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی، صدر یحییٰ خان نے اعلان کر دیا تھا کہ عسکری نظام عارضی ہے اور وہ اقتدارِ مملکت کو عوام کے نمائندگان کی طرف منتقل کر دینے کے لئے جلد از جلد انتظام کریں گے۔ یہ اعلان امید افزا ضرور تھا، لیکن چونکہ اس میں وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا، اس لئے ملک میں تذبذب اور عدم تیقن کی فضا موجود تھی۔ اب انہوں نے (اپنے ۲۸ نومبر کے قوم سے خطاب میں) آئندہ انتخابات کا نہ صرف اعلان کر دیا ہے بلکہ اس کے لئے ایک یقینی ٹائم ٹیبل بھی مقرر کر دیا ہے جس کی رُو سے مرکزی اسمبلی کے لئے عام انتخابات ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کرائے جائیں گے۔ اس سے آئینی تعطل دور ہو گیا ہے اور ملک میں اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس فیصلے کے لئے صدر محترم مستحق مبارکباد ہیں۔

ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس دعویٰ کی بنا پر کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے، وطن کی حدود قومیت کی تشکیل میں کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ مسلمان، ایمان (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک سے ایک مستقل، جداگانہ، قومیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی ہمارے مطالبہ کی بنیاد تھی اور اسی سے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر، اس کا مطلب یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں۔

تشکیلِ پاکستان کے وقت، انگریزوں کی عملداری کے مطابق، یہ ملک، مختلف صوبوں میں بٹا ہوا تھا — اُدھر مشرقی بنگال۔ اِدھر پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ۔ ہر چند یہ تقسیم انتظامی امور کے لئے تھی، لیکن (انگریزوں کی حکمتِ فرعونی کے تقاضا کے ماتحت) صوبوں کی یہی تفریق، خود مسلمانوں میں نسلی تفریق کا موجب بن چکی تھی۔ ہم نے یہاں پہنچکر، انتظامی امور کے پیشِ نظر، اس صوبائی تقسیم کو علی الحال رہنے دیا، لیکن اُس نسلی تفریق کو مٹانے کے لئے جو صوبوں کی لکیروں سے پختہ نقوش کی شکل اختیار کر چکی

تھی، کوئی عملی قدم نہ اٹھا — بلکہ قدم اٹھایا تو ایسا جس سے باہمی تفریق و تقسیم کی یہ گرہیں اور مضبوط ہو جائیں۔ (مثلاً) ۱۹۳۱-۳۲ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمان چونکہ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اس لئے انہیں سرکاری ملازمتوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے جداگانہ نیابت ملنی چاہیئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو اس مطالبہ کی مخالفت ہوتی تھی، سو ہوئی۔ لیکن خود مسلمانوں میں سے بھی بعض نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ "روٹیوں، بوٹیوں" پر اس قسم کا جھگڑا ہمیں کچھ زیب نہیں دیتا۔ بہی خواہانِ ملت کے زعماء کی طرف سے اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا کہ بظاہر یہ مطالبہ "روٹیوں بوٹیوں" کی تقسیم کا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے اثرات بڑے دور رس اور اس کے نتائج بڑے عمیق ہوں گے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملازمتوں کی جداگانہ نیابت کا اصول طے پا جائیگا تو اس سے یہ خود بخود دو قوموں میں بٹ جائینگے۔ اور ان میں ایسی خلیج حائل ہو جائے گی جو کبھی پاٹی نہیں جا سکے گی۔ چنانچہ جب یہ اصول طے پا گیا اور اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا تو مندرجہ بالا اندازہ ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک ایک اسامی کی تقسیم پر جب جھگڑا اٹھتا تھا تو ہندو اور مسلمان دو متخالف اور متحارب فریقوں کی شکل میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عملاً دو جداگانہ قوموں میں منقسم ہو جانے میں جس قدر اس ایک فیصلے نے ادا کیا تھا، دیگر عناصر اس سے کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے ان میں مستقل خلیج حائل کر دی تھی، اور ہمارے سیاسی رہنما اپنی اس اسکیم پر بہت نازاں تھے۔ اور بات تھی بھی ایسی جس پر بجا طور پر فخر کیا جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مختلف صوبوں کے لئے (یعنی مختلف نسلوں کے لئے) ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے اسی زمانے میں اس ناعاقبت اندیشانہ، تباہ کن، فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو اصولِ نیابت، ہندوستان میں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قدر مستقل تفریق و اختلاف کا موجب بنا تھا، وہ، پاکستان میں، مختلف صوبوں میں بسنے والے افراد میں، اسی قسم کی مستقل تفریق کا باعث بن جائے گا اور اس سے ایسی بین الصوبائی عصبیت پیدا ہو گی جسے آپ قیامت تک دور نہیں کر سکیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پاکستانی مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتے میں منسلک نہیں ہو سکیں گے۔ ہماری بات کسی نے نہ سنی اور ملک میں باہمی تشتت و افتراق کے شجرۃ الزقوم کا بیج بو دیا گیا۔ یہ بیج، اس بیس سال کے عرصہ میں ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کی ہر شاخ، دوسری شاخ سے الگ اور ہر پتہ دوسرے پتے سے

جدا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مسلمانانِ پاکستان کے دل سے ایک قوم کے افراد ہونے کا تصور تک مٹ چکا ہے اب یہاں بنگالی بستے ہیں، بلوچی بستے ہیں، سندھی بستے ہیں، پنجابی بستے ہیں، سرحدی بستے ہیں۔ پاکستانی کہیں نہیں بستے۔ وحدتِ مغربی پاکستان (ONE - UNIT) کم از کم اس علاقہ میں، صوبوں کی تفریق کو مٹانے کے لئے ایک عملی اقدام تھا۔ لیکن اس وحدت کو بھی انتظامی امور تک محدود رکھا گیا۔ اور ان صوبوں میں بسنے والوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے، یا قریب تر لانے کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ یہ انتظامی وحدت، مزید قلبی انتشار کا موجب بن گئی۔ اِدھر یہ ہوا، اور اُدھر بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اور یہ خلیج اس حد تک وسیع ہو گئی کہ اُن کے دل میں علیحدگی تک کے جراثیم پرورش پانے لگ گئے۔ کہیں لاہور ریزولیوشن کے متعلق سوال اٹھایا گیا کہ اس میں (STATE) نہیں بلکہ (STATES) کہا گیا ہے۔ کہیں صوبائی مکمل خود مختاری کا راگ الاپا گیا۔ کہیں مجیب الرحمٰن صاحب کے چھ نکات کو منشور بنایا گیا — اس انتشار و افتراق کا جذبہ محرکہ ملی مفاد یا مملکت کی بہی خواہی کے بجائے ہمارے خود ساختہ لیڈروں کا ذاتی مفاد تھا۔ مارشل لاء سے قبل کے ہنگامے اور شورشیں انہی رہزنانِ دین و دانش کی ملت فروشیوں اور عافیت سوزیوں کے کرشمے تھے، جن پر عوامی مطالبہ اور جمہوری تقاضا کا نگاہ فریب لیبل لگا دیا گیا تھا۔

صدر یحییٰ نے اچھا کیا کہ ان لوگوں کو مزید ہنگامے برپا کرنے کے مواقع بہم پہنچانے کے بجائے، ان کے مطالبات کو تسلیم کر کے آئندہ انتخابات کے لئے راستہ کو ہموار کر دیا۔ اب یہ کام منتخب اسمبلی کا ہو گا کہ وہ فیصلے کرے کہ ملک میں قومی وحدت پیدا کر کے، اسے خوشگواریوں سے ہمکنار کر دیا جائے۔ یا اس کے حصے بخرے کر کے، اسے (خاکم بدہن) تباہی کے جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے۔

آبادی کے لحاظ سے راستے دہی کے مطالبہ کا ایک دلچسپ (لیکن عبرت ناک) پہلو یہ ہے کہ ہمارا دعوے یہ تھا کہ ایک ملک میں بسنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم۔ اس وقت مشرقی پاکستان[1] میں ایک کروڑ کے قریب، ہندو آباد ہیں۔ لیکن اب وہ اور مسلمان ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں۔ اور انہی کو ملا کر، مشرقی پاکستان کی آبادی کو مغربی پاکستان کی آبادی سے زیادہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب ہندو اراکین آپ کی مجلس

---

[1] وہاں اب یہ تحریک بھی پھیلائی جا رہی ہے کہ اُس بازو کا نام "مشرقی پاکستان" کے بجائے "بنگلہ دیش" رکھا جائے!

دستور ساز اور مقننہ میں، بھی برابر کی حیثیت سے شریک ہونگے اور ملک کے لئے اسلامی آئین مرتب اور کتاب و سنت کے مطابق قوانین وضع کرنے کا فریضہ سرانجام دیں گے ـــــ اور "اقامتِ دین" کے مدعی خوش ہونگے کہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی ہوگئی ہے۔

صدر یحییٰ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے، ملک کی سیاسی پارٹیوں کو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ہوگی۔ یہ وہی پارٹیاں ہیں جن کی سیاسی سرگرمیوں نے ملک کو مارشل لاء لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پارٹیاں بھی وہی ہیں اور ان کے سرخیل بھی وہی۔ لہٰذا، ان کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق پیش گوئی کے لئے کسی ستارہ شناس کی ضرورت نہیں۔ اگر ان کی سابقہ فساد انگیزیوں اور ہنگامہ آرائیوں پر ان کی گرفت کی جاتی اور الزامات ثابت ہونے پر انہیں قرار واقعی سزا دی جاتی تو آئندہ کے لئے ان سے حسنِ کردار کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن اب تو یہ پہلے سے بھی زیادہ بپھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ امید ہے مارشل لاء کے ارباب بست و کشاد ان کی اس قسم کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھیں گے، اور اگر کہیں سے فتنہ اٹھتا نظر آئے گا تو اُسے شروع ہی سے کچل دیں گے تاکہ ملک کا امن پھر سے ان کی شر انگیزیوں کی نذر نہ ہو جائے۔ رَبَّنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

ہم ملک کے عوام سے عرض کریں گے کہ ہماری یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ قوم میں کوئی لیڈر بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ذاتی یا گروہ بندانہ مفاد سے بلند ہو کر، ملک و ملت کے مفاد و مصالح کو اپنے سامنے رکھے۔ نہ قوم کے نام پر چیخ و پکار کرنے والوں کے دل میں قوم کا کوئی درد ہے، نہ اسلام کے نام پر "خدا و رسولؐ کا واسطہ" دینے والوں کے سینے میں احیائے اسلام کی کوئی تڑپ۔ یہ لوگ بلند آہنگ نعروں سے آپ کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ذاتی اہمیت حاصل کر کے، اپنی قیمت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب سودا بازی کا وقت آتا ہے تو آپ کو پوچھتے تک نہیں۔ گزشتہ مذاکرات میں آپ نے نہیں دیکھا کہ تمام نقصان آپ لوگوں کا ہوا۔ اور ان "زعمائے قوم" میں سے کسی کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اسکے بعد بھی آپ دیکھیں گے کہ یہی حضرات اقتدارات کی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ جائیں گے۔ اور آپ ویسے کے ویسے خاک نشین رہیں گے۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھیں۔ خواہ مخواہ مشتعل ہو کر ان کے آلۂ کار نہ بنیں۔ ان کی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لیں اور جب انتخابات کا وقت آئے، تو نہایت اطمینان اور سکون سے فیصلہ کریں کہ آپ کا صحیح نمائندہ کون ہو سکتا ہے۔ اسے ووٹ دیدیں۔ یاد رکھئے۔ پراپیگنڈہ اس دور کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ ہے اور جن پارٹیوں کے پاس کہیں سے فنڈز آجاتے ہیں، وہ اس حربہ کو سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پراپیگنڈہ، انسان کے سمجھنے، سوچنے اور فیصلہ

کرنے کی قوت کو مفلوج کر دینا ہے۔ اس حربہ کو ناکام بنا دینے کا طریق یہ ہے کہ آپ نہ ایک فریق کے پراپیگنڈہ پر کان دھریں نہ دوسرے فریق کے۔ خاموشی سے اپنے کام کاج میں لگے رہیں اور وقت آنے پر اپنی صوابدید کے مطابق، بہترین امیدوار کو ووٹ دے آئیں۔ اسی میں قوم کی بہتری ہے اور اسی میں مملکت کی بہبود۔

ملک کا آئین کس انداز کا ہونا چاہیئے؛ اس کے متعلق ہم وقت آنے پر اپنی تجاویز پیش کریں گے۔

——— (۰) ———

(۲)

ملک میں جس سرعت سے جرائم کی آگ پھیل رہی ہے، اسے دیکھ کر ہر قلب حساس، دفعۃً پریشان ہو جاتا ہے۔ کہ جب مارشل لاء کے زمانے میں یہ حالت ہے، تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہم اس کے متعلق مکمل اعداد و شمار پیش کرکے، آپ حضرات کو دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتے۔ صرف ایک دن یعنی ۲۴ دسمبر کے روزنامہ امروز کے صفحۂ اول کی دو خبروں پر اکتفا کرتے ہیں جو ایک (لاہور) شہر سے متعلق ہیں۔ ایک خبر یہ ہے۔

چار روز کے دوران لاہور میں ساتواں قتل۔ ملزم فرار ہو گئے۔

اور دوسری خبر یہ کہ:-

سمن آباد میں چوروں کی دھاندلی۔ ایک رات میں چوری کی سات وارداتیں۔

اس سے آپ پورے ملک میں جرائم کی رفتار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سال گزشتہ (۱۹۶۹ء میں) لاہور میں، پولیس نے غنڈوں کے خلاف ایک مہم شروع کی تھی جس کے نتیجہ میں پندرہ سولہ مشہور بدمعاش غنڈے پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے اور بہت سے حوالۂ قید وبند کر دیئے گئے تھے۔ اس سے اہلِ شہر سکھ کی نیند سونے لگ گئے تھے۔ اس کے بعد، یہ تجویز بھی سامنے آئی تھی کہ شہر میں جتنے لوگ غنڈوں کے سرپرست ہیں، اور وہ بڑے معتبر بنے پھرتے ہیں انہیں بے نقاب کیا جائے۔ سننے میں آیا تھا کہ ان کی فہرستیں بھی مرتب ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا کہ نہ وہ فہرستیں شائع ہوئیں، نہ غنڈوں کے سرپرست بے نقاب ہوئے ——— اور غنڈوں کے خلاف مہم بھی غالباً فسادات کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہم اربابِ حل وعقد کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ جرائم پیشہ عناصر کے خلاف اس قسم کی مہم پھر چلائی جائے اور ان کے سرپرستوں کو نہ صرف بے نقاب کیا جائے بلکہ انہیں، مجرمین کی اعانت کے جرم میں قرار واقعی سزا دی جائے۔ اگر مارشل لاء کے حکام اپنی دلچسپی سے پہلے اتنا کام اور کر جائیں تو ان کا یہ بھی ملک پر احسان ہوگا۔

——— (۰) ———

(۳)

عسکری نظام نے، بددیانت، بدکردار، بدعنوان، افسروں کے خلاف چارہ جوئی کے سلسلہ میں بڑا جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے جس کے لئے وہ ہر دیانت پسند شہری کی طرف سے مستحق تحسین و تہنیت ہیں ہمیں امید ہے کہ اس تحقیق کے بعد، جو لوگ فی الواقعہ مجرم ثابت ہوں گے انہیں عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔

اس ضمن میں متعلقہ افسروں کی جو فہرستیں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کس بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں، لیکن جیسا کہ ملک کے بعض لیڈروں نے کہا ہے، ان میں بعض ایسے افسروں کے نام بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی نیک نامی کی شہرت عام تھی۔ چونکہ ان کے کیس حکومت کے مقرر کردہ ٹرائی بیونل کے سامنے جائیں گے اس لئے ہم اس وقت اس سلسلہ میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ ٹرائی بیونل ان افسروں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیں گے اور عدل کے عام تقاضا کے مطابق، اس مفروضہ پر ان کے مقدمات کی سماعت کریں گے کہ یہ ہنوز ملزم ہیں، مجرم نہیں۔ اور اس کے بعد جو افسر بے گناہ ثابت ہوں، ان کی بحالی اس شکل میں کی جائے کہ ان کی نیک نامی کو جو دھبا لگا ہے اس کا کلی ازالہ ہو جائے۔ اس سے خود نظم و نسق حکومت پر بھی عمدہ اثر پڑے گا۔

لیکن ملک سے بدعنوانی (CORRUPTION) دور کرنے کے لئے حکومت کا یہ اقدام ہنگامی اور عارضی نتیجہ پیدا کر سکیگا، اس لئے کہ یہ صرف علامات مرض کا علاج ہوگا۔ علت مرض کا نہیں۔ اور جب تک اصل علت کا ازالہ نہ کیا جائے، مرض رفع نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس وقت ہمارے ہاں رشوت ستانی، معاشرہ کا گویا ایک جزو بن چکی ہے۔ یہ اعلیٰ افسروں تک محدود نہیں جن کے نام شائع شدہ فہرست میں آ گئے ہیں۔ رشوت کے اس قدر عام ہو جانے کے مسئلہ پر جب ذرا بنظر تعمق غور کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ

(۱) چھوٹے ملازمین میں رشوت کی وجہ احتیاج ہے۔ جو کچھ انہیں ملازمت کے عوض میں ملتا ہے اس سے ان کی اور ان کے بیوی بچوں کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ (مثلاً) جس پولیس کانسٹیبل کو آپ ستر پچھتر ماہوار تنخواہ دیں اور دو روپے ماہوار کرایہ مکان، وہ اگر ناجائز ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ نہ کرے تو وہ اور اس کے اہل و عیال زندہ کس طرح رہیں! (اس سلسلہ میں ہم اس سے پہلے ان صفحات میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔)

(۲) زیادہ تنخواہ لینے والے افسروں میں رشوت کی وجہ مستقبل کے متعلق عدم تحفظ (IN-SECURITY) اور ہوس زراندوزی ہے۔

اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے ملک کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلی۔ یعنی ایسا نظام قائم کرنا جس کی رُو سے مملکت کے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا حکومت کی ایسی ذمہ داری قرار پا جائے جسے پورا نہ ہونے کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے۔ اور اس کے بعد ذاتی املاک (PRIVATE PROPERTY) کی یکسر ممانعت۔ یعنی اشیائے مستعملہ کے علاوہ کسی قسم کی جائیداد بنانے کی قطعاً اجازت نہ ہو۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص ناجائز ذریعہ سے کچھ حاصل کرے تو اسے سنگین سزا دی جائے۔ واضح رہے کہ سزا کے ذریعے اصلاح صرف مستثنیات تک محدود ہوتی ہے۔ اس سے معاشرہ کی عام اصلاح نہیں ہو سکتی۔ عام اصلاح کے لئے معاشرہ کے نظام میں بنیادی تبدیلی اور افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیت ضروری ہوتی ہے۔ بہر حال عسکری نظام ان بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے جو تدابیر اختیار کرے انہیں بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے مستقل اقدامات اور بنیادی تبدیلیوں کے لئے لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔

انسانی مسائل کے حل میں ——

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں تاریخِ انسانی کی عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لے کر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟

اسے پڑھیئے اور سوچیئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسان نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت
بارہ روپے

پتہ:
ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

پیامِ عید

جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا

پرویز صاحب کا خصوصی درس، جو ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کی صبح ۲۵-بی، گلبرگ ۲، لاہور میں دیا گیا!

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، عید الفطر درحقیقت، نزولِ قرآن کریم کی تقریبِ سعید پر جشنِ مسرت منانے کا نام ہے۔ اور یہ وہ جشن ہے جس کے منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے جب کہا کہ۔ یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف، تمہارے نشو و نما دینے والے کی جانب سے ایک ایسا ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور اُن لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشو و نما اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ یہ صرف خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ اس قسم کا ضابطۂ زندگی تمہیں مل گیا ہے۔ ورنہ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ وہ متاعِ بے بہا ہے کہ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۷-۵۸)۔ انسان جو کچھ بھی جمع کرے، یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے ـــــ تمام متاعِ کائنات سے زیادہ بیش بہا انمول خزانہ۔

ہم اس جشن کو ہندوستان میں بھی منایا کرتے تھے ـــ وہاں کے مسلمان اب بھی مناتے ہیں ـــ لیکن وہ محض ایک رسم تھی جسے ہم پورا کر لیا کرتے تھے ـــ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی قسمت میں جشن کی مسرتیں کہاں ؟ یہی وہ الم انگیز حقیقت تھی جسے اقبالؒ نے ان جانگداز لیکن بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں

عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

آزادی کے بعد پہلی عید

ہمیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پہلی عید اگست ۱۹۴۷ء میں اعلانِ آزادی کے دو ہی دن بعد دیکھنی نصیب ہوئی۔ لیکن اس وقت کیفیت عجیب تھی۔ ایک طرف حصولِ آزادی' اور عیدِ آزاداں کے نشاط آفریں وطرب انگیز احساسات۔ اور دوسری طرف ہندوستان سے آنے والے ہمارے قافلوں کا قتلِ عام' اور بقیۃ السیف درماندہ رہروں کی تباہ حالی اور بے سروسامانی! وہ عید' از دحامِ مسرت وشادمانی اور ہجومِ مصائب وآلام کے روح پرور اور جاں فرسا آمیزہ کی تقریب تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شدائد ونوائب کی جو قیامت ہم پر اس وقت ٹوٹ پڑی تھی ،عید کا چاند اس کے غبار میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے درخشندہ مستقبل کی امید کی کرنیں تھیں جو ہمارے تصورات کی راتوں کو تاریک نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اور منشورِ آزادی کی نشیرِ جانفزا تھی جو بار بار' پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ لَا تَهِنُوا - وَلَا تَحْزَنُوا - وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ - مت گھبراؤ۔ مت خوف کھاؤ۔ قانونِ نظرت یہ ہے :

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

غم آلود عیدیں

اس عید کی ماتم سامانیوں کو ہم نے ان تابندہ امیدوں کے سہارے برداشت کر لیا لیکن کیا۔ کسی قوم کی سوختہ بختی اور حرماں نصیبی اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے کہ آزادی کے اس بائیس سال میں ہمیں ایک عید بھی ایسی دیکھنی نصیب نہ ہوئی جسے "عیدِ آزاداں" کہا جا سکے۔ اس کے برعکس' ہر سال کی عید ہمارے لئے پیغامِ تہنیت لانے کے بجائے' گذشتہ عید کے مقابلہ میں زیادہ غم آلود اور سیاہ پوش بن کر آئی ـــ اور جس عید کے استقبال کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں' میرے قلبِ حساس کے نزدیک' وہ سب سے بڑھ کر پیامبرِ حزن وافسردگی اور پیکرِ اندوہ وملال ہے۔ ایسی خزاں رسیدہ اور سوگوارِ بہار عید کیا تو ہمارے دورِ محکومی میں بھی نہیں آیا کرتی تھیں ـــ میں نے کبھی مایوسیوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیا ـــ جس کا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہو' وہ مایوس کس طرح ہو سکتا ہے ـــ لیکن

حقائق کو خود فریبی کے پردوں میں بھی تو چھپایا نہیں جا سکتا۔ میں آج کی نشست میں آپ احباب کی خدمت میں عرض کرونگا کہ ہماری ان افسردگیوں اور اندوہ ناکیوں کی وجہ کیا ہے، اور انہیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق پر غور کر لیا، تو اس سے ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنی مایوسیوں کو پھر سے امیدوں میں بدل دیں۔ اور یوں ہم ہلالِ عید سے کہہ سکیں کہ اب تم ہماری ہنسی نہیں اڑا سکتے۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

—— (٠) ——

سلسلۂ رشد و ہدایت

عزیزانِ من! خدا نے ایک عظیم سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا — ہر بستی میں رسول، ہر قریہ میں منذر، ہر زمانے میں پیغامبر — اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آسمانی کتاب — یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا، تاآنکہ اس کی تکمیل، اس سلسلہ کی آخری کڑی حضور خاتم النبیینؐ، اور خدا کی آخری کتاب، قرآن کریم سے کر دی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تمام سلسلۂ نبوت و رسالت کا بنیادی مقصد کیا تھا؟ اسے سنیئے اور غور سے سنیئے۔ قرآن کریم میں ہے — وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹)۔ شروع میں تمام انسان ایک برادری کی طرح رہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف کرنا شروع کر دیا اور گروہوں اور قبیلوں میں بٹ گئے۔ ان کے اس اختلاف و افتراق کو رفع کرنے کے لئے خدا نے کیا کیا؟ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ (۲/۲۱۳)۔ اللہ نے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا جو انہیں باہمی اخوت اور اتحاد کی زندگی بسر کرنے کے حیات بخش نتائج کی خوشخبری دیتے تھے اور اس سے انہیں آگاہ کرتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنے اختلافات برقرار رکھے تو اس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہوگا۔ ان رسولوں کے ساتھ، خدا نے ضوابط قانون بھی نازل کئے جو لوگوں کو اختلافات دور کرنے کے طور طریق بتاتے تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ آسمانی ہدایت کے اس سلسلۂ زریں کا بنیادی مقصد کیا بتایا گیا ہے؟ یہ کہ انسانوں کے باہمی اختلافات و افتراقات کو دور کر کے انہیں ایک عالمگیر برادری کی سلک گہربار میں منسلک کر دیا جائے۔ آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں کی ابتدائی زندگی سے آگے بڑھ کر

ابتدائی زندگی

قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجۂ جامعیت اشتراکِ نسل تھی۔ یعنی ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد مل جل کر ایک جگہ رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ یا خاندان تھا۔ یہاں ایک

قبیلہ' وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے ٹکراؤ سے ان قبائل میں باہمی جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ ان تصادمات میں حریف اور حلیف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہیں تھا' بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی اختلافی زندگی کا اولین مظاہرہ۔ اب آپ ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو الٹ کر اپنے زمانے میں پہنچ جایئے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دور سے اتنا مختلف سمجھتا ہے جتنا انسان' اپنے آپ کو حیوان سے متمیز و ممتاز قرار دیتا ہے۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیم و تفریقِ انسانیت کا تعلق ہے' اس دورِ علم و تہذیب کا انسان اُس عہدِ جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے؟ وہاں انسانوں کی تقسیم قبائل کی رُو سے ہوتی تھی۔ یہاں وہ تقسیم اقوام کی رُو

اقوام کی تفریق

سے ہوتی ہے۔ اور قوم اس کے سوا کیا ہے کہ وہ قبیلہ ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا دوسرا نام ہے۔ یعنی جب ایک قبیلہ وسیع ہو جائے تو اسے قوم کہا جاتا ہے۔ قبائل کی طرح قوموں کی ابتدائی تقسیم بھی نسل کی بنیادوں پر ہوتی یا اختلافِ رنگ کی رُو سے۔ اس سے آگے بڑھیئے تو یہ تفریقِ انسانیت' جغرافیائی حدود کی رُو سے ظہور میں آتی ہے۔ اسے وطن کی تخصیص کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی خطۂ زمین کے حدود اربعہ کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد اور اس کے باہر کے انسان دوسری قوم کے اجزاء ـــ اور یہ دونوں قومیں ـــ بلکہ کرۂ ارض پر بسنے والی تمام قومیں' انہی خود ساختہ لکیروں کی بنا پر ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ـــ کیا تہذیب و تمدن کے نام پر اس سے بڑھ کر کوئی اور وحشت و بربریت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک انسان' اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کا محض اس لئے خون کا پیاسا ہو' کہ وہ دریا کے اُس پار بستا ہے؟ پھر ایک ہی قوم کے اندر ذاتی مفاد پرستیوں کی بنا پر' مختلف گروہ اور پارٹیاں' اور سب باہمد گر دست و گریباں یا مصروفِ جدال و قتال ـــ یہ تھے نوعِ انسان کے وہ اختلافات جنہیں مٹانے کے لئے خدا کے رسول آتے تھے۔ ان کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ تمام انسان' اپنے خود ساختہ اختلافات کو ختم کر کے' وحی کی راہ نمائی میں ایک برادری کی طرح محبت و اخوت کی زندگی بسر کریں۔ جو لوگ "وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق" کے اس اساسی اور بنیادی اصول کی صداقت پر ایمان لے آتے وہ ایک برادری کے افراد قرار پا جاتے۔ جو اس سے انکار کرتے وہ دوسری قوم کی حیثیت

وحی کی رُو سے معیارِ قومیّت

اختیار کر جاتے۔ قرآن کریم نے سلسلۂ رسالت کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ کی دعوت سے کیا ہے۔ آپ دیکھئے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جونہی ان کی دعوت کی ابتداء ہوتی ہے' قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لے آتے ہیں، دوسرا وہ جو اس کی تکذیب کرتا ہے۔ جو افراد اس دعوت پر ایمان لے آتے ہیں، ان میں وہ تمام تفریقات ختم ہو جاتی ہیں جن سے ایک انسان دوسرے انسان سے جدا ہوتا ہے۔ ان میں وجۂ اشتراک صرف ایمان کا رشتہ رہ جاتا تھا ۔۔۔ اب "اپنوں" اور "غیروں" کا معیار بالکل بدل جاتا تھا ۔۔۔ اپنے وہ جو اس نظریۂ حیات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ غیر وہ جو اس نظریہ پر ایمان نہیں لاتے۔ جو اس نظریہ پر ایمان نہیں لاتے، ان سے اِس جدید برادری کا تعلق نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اگر خود نوحؑ کا بیٹا بھی اس برادری میں شامل نہیں ہوتا تو (قرآن کے الفاظ میں) وہ حضرت نوحؑ کے "اہل" میں سے شمار نہیں ہوتا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی اگر اس دعوت پر ایمان نہیں لاتی تو وہ بھی اپنوں میں سے نہیں رہتی۔ اور اگر حضرت ابراہیمؑ کا باپ اس دعوت کی تکذیب کرتا ہے تو اس سے (حضرت) ابراہیمؑ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم اشتراکِ وطن کے باوجود قومِ فرعون سے الگ تھی لیکن قومِ فرعون کے افراد اشتراکِ ایمان میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھے، وہ ان کے اپنے بن گئے تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح وسیع ہوتا چلا گیا تا آنکہ رسولِ کافۃ للناس کے عہدِ مبارک میں تمام نوعِ انسان کی تقسیم اس معیار کے مطابق قرار پا گئی۔ قرآن نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے کفار آ گئے۔ اور ان کے مقابلہ میں جب ارشاد ہوا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ (۴۹/۹) تو اس امت کی عالمگیریت اور آفاقیت بھی حدود فراموش اور قیود ناآشنا قرار پا گئی۔ نظریۂ حیات کے اشتراک و اختلاف کی بنیاد پر انسانوں کی اس تفریق و تقسیم کا فقید المثال مظاہرہ ہمیں بدر کے میدان میں دکھائی دیتا ہے جو اسی رمضان کے مہینے کی سترہ تاریخ کو، جب روزے پہلے پہل فرض ہوئے تھے، معیارِ قومیت کی محسوس شہادت بن کر سامنے آیا تھا اور جس کی وجہ سے اسے "یوم الفرقان" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس میدان میں جو دو صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں شمشیر بکف کھڑی تھیں، کن افراد پر مشتمل تھیں؟ ان پر جن کا مسلک ایک تھا، زبان ایک تھی، رنگ ایک تھا، نسل ایک تھی، حسب و نسب ایک تھا لیکن ان تمام اشتراکات کے باوجود ایک وجۂ افتراق تھی جس نے ان تمام وجوہِ جامعیت کو کالعدم قرار دے کر انہیں ایک دوسرے کے مدمقابل لا کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح دنیا کو بتا دیا تھا کہ وحیِ آسمانی کی رو سے قوموں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔

یوم الفرقان

وہ وجۂ تفریق و علتِ تقسیم کیا تھی؟ ایمان اور صرف ایمان۔ ان صفوں میں ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف ان کے مدمقابل ان کا بیٹا۔ ادھر حضرت حذیفہؓ تھے تو صفِ اعداء میں ان کا باپ عتبہ۔ ادھر حضرت علیؓ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل ۔۔۔ نہیں، اور آگے بڑھیے۔ ادھر خود محمدؐ تھے

تو سامنے کی صف میں آپؐ کے حقیقی چچا عباسؓ اور آپ کے داماد ابوالعاصؓ۔ یہ تھی وہ اصولی تقسیم جو وطن، رنگ، زبان، نسل کی غیر فطری حدود سے ماورا تھی۔ اس تقسیم کی رُو سے حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حضورؐ کا اپنا چچا، ابولہب، غیروں میں سے۔ روم کا صہیبؓ بیگانہ نہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ یہ تھی وہ امتِ وسطیٰ جسے آسمانی راہ نمائی کے ابدی اصول کے مطابق حضورؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ وہ امت جو ساری دنیا کے غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک ممتاز جماعت تھی اور جس جماعت کے اندر کسی قسم کی کوئی تفریق و تمیز اور کوئی اختلاف و افتراق نہیں تھا۔ قرآن نے اس جماعت کو اسی لئے قوم نہیں کہا، امت کہا ہے کہ قوم کی وجہ جامعیت خارجی اسباب و علل ہوتے ہیں، لیکن لفظ اُمت، کا مادہ اُمّ ہے جس کے حقیقی معنی کسی شے کا حقیقی سرچشمہ یا اصل الاصول ہے۔ اُمت خارجی امتیازات کے اختلاف کے باوجود اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہوتی ہے۔ اور وہ اصل ہوتی ہے اشتراکِ ایمان — یہ تھی وہ امتِ واحدہ جو دنیا میں مسلمانوں کے نام سے متعارف ہوئی۔

تفرقہ سنگین جرم

اس امت کو واضح الفاظ میں بتا دیا گیا تھا کہ اگر تم میں باہمی تفرقہ پیدا ہو گیا تو تم مومن نہیں رہو گے، مشرکین میں سے ہو جاؤ گے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ..... (۳۰/۳۱) ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اختلاف و افتراق خدا کا عذابِ عظیم ہے — وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ (۳/۱۰۵) ان پر یہ حقیقت واشگاف کر دی گئی تھی کہ تم اس رسول پر ایمان لانے سے ایک جداگانہ اور منفرد امت قرار پاتے ہو۔ اگر تم میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو اس رسول سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہے گا — إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۔ (۶/۱۵۹) یہ قرآنی تصریحات بڑی اہم ہیں اور ان کا ذہن نشین کر لینا اور سامنے رکھنا نہایت ضروری۔

دین اور مذہب میں فرق

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسولؐ ایک امت کی تشکیل کیوں کرتا تھا۔ مذہب کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ اس سے بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے انسان خدا کی پرستش، پوجا، بندگی، کرتا ہے اور یہ سب کچھ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی جماعت یا امت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مذہب کا تصور یہی ہے لیکن خدا کی طرف سے دین عطا ہوتا ہے۔ مذہب نہیں۔ (" مذہب " کا تو لفظ تک قرآن میں نہیں آیا) اور دین ایک ہیئتِ اجتماعیہ کا

نام ہے جس میں احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت، ایک نظام کے ماتحت کی جاتی ہے۔ اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے جو مملکت قائم کی تھی تو وہ نہ تو یونہی، اتفاقیہ طور پر مل گئی تھی، اور نہ ہی (عام تصور کے مطابق) سیاسی ضروریات کا تقاضا تھی۔ یہ مملکت اس لئے وجود میں آئی تھی کہ سیاسی تمکن کے بغیر (یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر) دین ایک زندہ حقیقت بن ہی نہیں سکتا۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ (اور تو اور) اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے بھی قرآن، تمکن فی الارض کو لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۔ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۔ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا۔ تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کریں گے اور معروف کے احکام جاری کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ غرضیکہ ان کے تمام معاملات احکامِ خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔" اس دین میں اطاعت کسی انسان کی نہیں بلکہ خدا کے احکام کی ہوتی تھی۔ لیکن یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہوتی تھی، اجتماعی طور پر، ایک نظام کے تابع ہوتی تھی۔ حضورؐ نبی اکرم اس نظام یا مملکت کے سب سے پہلے سربراہ تھے، اس لئے اس اطاعت کو "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کہا جاتا تھا۔ یعنی "نظامِ خداوندی کی اطاعت"۔ اس نظام کے مرکز، نبی اکرمؐ کے فیصلوں کے مطابق۔

حضورؐ نبی اکرم نے اس امت کی تشکیل فرمائی اور اسلامی مملکت میں دین کے نظام کو عملاً قائم کرکے بتا دیا کہ اطاعتِ خداوندی سے مفہوم کیا ہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہی نظام خلفائے راشدین کے زمانے میں قائم رہا۔ اب، مرکزِ ملت، خلیفۃ المسلمین تھا اور اس کے فیصلوں کی اطاعت، "بمنزلہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کے تھی۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ

> اسلام نام ہے امتِ واحدہ کے اُس نظامِ اجتماعیہ کا جس میں احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت، مرکزِ ملت کے توسط سے کی جاتی ہے۔

اگر ان اساسی اجزاء میں سے کوئی ایک جزو بھی کم ہو جائے تو اسلام باقی نہیں رہتا۔ بالفاظِ دیگر:

(۱) اگر امت میں تفرقہ پیدا ہو جائے اور اس طرح وہ امت، امتِ واحدہ نہ رہے۔ یا

(۲) اجتماعی نظام کے بجائے، احکامِ خداوندی کی اطاعت انفرادی طور پر کی جانے لگے۔ یا

(۳) اطاعت کے مراکز ایک سے زیادہ ہو جائیں۔ مثلاً سیاسی امور کے لئے الگ مرکز اور امورِ شریعت کے لئے الگ مرکز۔

تو ــــ اسلام باقی نہیں رہتا۔ یعنی دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ کے بعد

نبی اکرمؐ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک 'اسلام' دین کی حیثیت میں باقی رہا لیکن پھر اس میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوا۔ میں اس مقام پر، اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ اس بگاڑ کے اسباب وعلل کیا تھے، اس کی ابتدا کس طرح سے ہوئی اور اس کے ذمہ دار کون تھے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور طویل وقت کا متقاضی۔ میں اس وقت صرف اس بگاڑ کے عملی نتائج پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مثلاً یہ کہ:-

(۱) پہلے مملکت اُمت کی تھی۔ اب وہ مختلف خانوادوں اور ملکوں میں بٹ گئی ۔۔۔ بنی امیہ، بنی عباس، بنی فاطمہ۔ ترک۔ مغل۔ افغان۔ ایران وغیرہ۔

(۲) پہلے 'مرکزِ اطاعت' ایک تھا۔ پھر ثنویت پیدا ہوگئی۔ سیاسی امور، بادشاہوں نے سنبھال لئے اور امورِ شریعت 'مذہبی پیشوائیت' نے اپنی تحویل میں لے لئے۔

(۳) اس ثنویت کے نتیجہ میں اُمت میں مذہبی تفرقہ پیدا ہوگیا اور امتِ واحدہ رہنے کے بجائے شیعہ، سُنی۔ حنفی۔ مالکی، شافعی، حنبلی وغیرہ فرقوں میں بٹ گئی۔

(۴) فرقوں سے آگے بڑھے تو ان میں نسلی تفریق نے سر اُبھارا ۔۔۔ عربی۔ ایرانی۔ تورانی، منگولی۔ افغانی وغیرہ ۔۔۔ پھر نسلی امتیازات مزید شاخوں میں تقسیم ہو کر سید، پٹھان، راجپوت، شیخ۔ اعوان برادریاں وجود میں آگئیں۔

(۵) اور آخر میں یہ کہ مغربی تصورِ قومیت سے متأثر ہو کر اشتراکِ وطن کو معیارِ قومیت بنا لیا گیا۔ اور اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے امتزاج سے ایک قوم وجود میں آگئی۔

آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں، حقیقی اسلام، یعنی دین، کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی اس امت میں باقی رہ گیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم رفتہ رفتہ اُسی مقام پر آگئے تھے جس مقام پر 'ظہورِ اسلام' کے وقت سابقہ اہلِ کتاب تھے۔ ان کے ہاں 'دین'، مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا اور باہمی اختلافات و تفریقات سے ان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی تھی ۔۔۔ بعینہٖ یہی حالت ہماری ہو چکی تھی۔ کہا جائے گا کہ اُن لوگوں کے پاس 'خدا کی کتاب ۔۔۔ یعنی ضابطۂ ہدایت ۔۔۔ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی لیکن ہمارے ہاں وہ بالکل محفوظ تھی۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کتاب کا ہمارے ہاں مصرف کیا رہ گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کتاب کوئی تعویذ تو نہیں کہ اسے کپڑے میں لپیٹ کر یا چاندی میں منڈھا کر، گھر میں رکھ لیا جائے تو گھر جملہ آفات سے محفوظ ہو جائے۔ کتاب کی موجودگی سے مراد یہ ہے کہ وہ ہماری زندگی کے لئے ضابطہ قرار پائے اور ہم اس کے مطابق اپنے مسائل کو حل کریں۔ اگر کتاب کی یہ حیثیت نہ رہے تو اس کی موجودگی صرف "حصولِ ثواب"

کے لئے رہ جاتی ہے۔ اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو کتاب کی موجودگی اور عدم موجودگی سے عملاً کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سابقہ اہلِ کتاب اپنے فیصلے انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ ہم بھی اپنے فیصلے انسانوں ہی کی بنائی ہوئی شریعت کے مطابق کرتے ہیں۔ (لہٰذا جب تک یہ صورتِ حال باقی رہے) کتاب کا ہونا یا نہ ہونا یکساں ہوتا ہے ـــــ بلکہ ہمارے ہاں تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کتاب خداوندی کو عملاً وجود میں لانے کی بات کرتا ہے اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، کیونکہ اس سے مذہبی پیشوائیت کے قصرِ اقتدار میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔

(۰)

اقبالؒ بہرحال، یہ تھی ہماری حالت جو صدیوں سے ..... چلی آ رہی تھی۔ اور ہندوستان میں ہماری زبوں حالی انتہائی شدت تک پہنچ چکی تھی کہ مبداءِ فطرت کی کرم گستری سے یہاں ایک دیدہ ور پیدا ہوا جس نے خدا کی اس کتابِ عظیم پر غور و تدبر سے دین کا سراغ پا لیا اور ملت کے اس ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لانے کا عزم کر لیا۔ اس نے ملتِ اسلامیہ سے پکار کر کہا کہ تمہاری ذلتوں اور نامرادیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ:

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اور اس کا علاج یہ ہے کہ:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اس حکیم الامت، داعیٔ انقلاب نے دیکھا کہ مغرب نے وطن کو جو معیارِ قومیت قرار دیا تھا مسلمان اس سے بُری طرح متاثر ہو رہا ہے اور اگر یہ تصور غالب آ گیا تو اسلام کے احیاء کے لئے کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی پوری قوت سے باطل کے اس نظریہ کے خلاف آواز بلند کی۔ اور کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ جور و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

"وطنی قومیت" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک ملک کے اندر بسنے والے تمام افراد، بلالحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یعنی اس نظریہ کی رُو سے ایمان یا آئیڈیالوجی معیارِ قومیت نہیں ہوتی۔ اشتراکِ وطن معیار قرار پاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ وہ نظریہ ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اقبالؒ نے اپنی ملت کو یہ کہہ کر اس کے مقام سے آگاہ کیا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس نے پھر اپنی اس آواز کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر مختلف ممالکِ اسلامیہ تک پہنچایا اور ان سے واشگاف الفاظ میں کہا کہ یاد رکھو۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اس نے، درد و اثر میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا کہ

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبارِ آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس کا پیغام یہ تھا کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

پاکستان کا تصوّر

نسلوں اور وطنوں کی چار دیواریوں میں بٹی ہوئی اس امت کو پھر سے ملتِ واحدہ بنانے کے اس پیغامِ حیات آور کے ساتھ، اقبالؒ نے اسلام کو، جو ایک

مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، پھر سے دین میں تبدیل کر کے ایک زندہ حقیقت بنانے کے تصور کو بھی عام کیا اور اس کے لئے عملاً یہ تجویز کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ مملکت میں مرکوز کر کے، اسے احیائے اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ یہ تھی وہ تجویز جسے انہوں نے الٰہ آباد کے مشہور خطبہ صدارت میں پیش کیا، اور پھر باقیماندہ عمر میں اسے عام کرتے چلے گئے۔ ہندو کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی، لیکن آسمان کی آنکھ اس نظارہ پر محوِ حیرت تھی کہ اس کی شدید ترین مخالفت، اسلام کے اجارہ دار، علمائے کرام کی طرف سے ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ ان کی طرف سے یہ مخالفت کچھ غیر متوقع نہ تھی۔ جب بنی اسرائیل کے پیامبرِ انقلاب حضرت عیسیٰؑ نے اس زمین پر "آسمان کی حکومت" قائم کرنے کی دعوت دی تھی تو یہودیوں کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) نے یہ کہہ کر اس کی شدید مخالفت کی تھی کہ

> اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم پر بڑی مصیبت ہو گی۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس وقت ہم اپنے مناصب سے الگ کر دیئے جائیں گے۔ اور ہم مجبور ہو جائیں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت، خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور گورنر دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور وہ اس میں مداخلت نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہے کریں۔ اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ اسے ہم روزہ اور قربانی سے راضی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ ہو گا جب تک اللہ کی عبادت اس طرح ہوتے نہ دیکھے جس طرح موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس)

نظریۂ پاکستان کی مخالفت

مذہبی پیشوائیت کو سیکولر نظامِ حکومت (SUIT) کرتا ہے۔ جس میں مذہبی امور، ان لوگوں کی تحویل میں دے دیئے جاتے ہیں۔ اور حکومت ان میں دخل انداز نہیں ہوتی۔ اس طرح، ان لوگوں کی ایک متوازی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور اپنے دائرہ اقتدار میں یہ مختارِ کل ہوتے ہیں۔ لیکن دین ـــ یعنی اسلامی مملکت ـــ میں یہ شکل باقی نہیں رہتی۔ اس میں مذہب و سیاست کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے تو مذہبی پیشوائیت کا اقتدار تو ایک طرف، ان کا وجود تک باقی نہیں رہتا۔ یہ وجہ ہے کہ دین ـــ یعنی اسلامی نظامِ حکومت ـــ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے۔ یہ تھی وہ بنیادی وجہ جس کی بنا پر نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اقبال کے اس تصورِ قومیت اور نظریۂ مملکت کی شدید ترین مخالفت ہوئی۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ مختلف مذاہب کے پیرو بستے ہیں۔ یہ سب ایک وطن کے

باشندے ہونے کی حیثیت سے ایک قوم کے افراد ہیں، یہ کہنا کہ ان میں سے مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر ایک الگ قوم ہیں، حقیقت کا بطلان ہے۔ علومِ دین کے وارث ہونے کے مدعیوں کی طرف سے دین کے اس بنیادی اصول کی اس طرح مخالفت علامہ اقبالؒ پر کس قدر شاق گزری تھی، اس کا اندازہ اُن کے اُن تین اشعار سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے (یوں کہئیے کہ) اپنے بستر مرگ سے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اس اعلان پر تلملا کر کہے تھے کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" انہوں نے کہا تھا کہ

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

جب ان حضرات سے پوچھا جاتا ہے کہ اس قسم کی متحدہ قومیت کی حکومت میں، اسلام کا کیا حشر ہوگا، تو وہ جواب میں کہتے کہ یہاں سیکولر حکومت ہوگی اور ہندو اسکی ضمانت دیتا ہے کہ مسلمانوں کو اعتقادات عبادات اور شخصی قوانین کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ یہی تھا اسلام کا وہ تحفظ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

بہرحال، علامہ اقبالؒ اپنے پیغام کو عام کرتے ہوئے، ۱۹۳۸ء میں راہیِ دارالبقا ہوگئے اور یہ شمع رہبرِ فرزانہ محمد علی جناحؒ کے ہاتھوں میں دے گئے۔

قائداعظمؒ

قائداعظمؒ نے اسلام کے ان دو بنیادی تصورات کو اس قدر عام کیا کہ ہندوستان کی فضا ان سے گونج اٹھی۔ اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے اصول کو انہوں نے، اپنے مخصوص انداز میں، اس وضاحت سے بیان کیا اور دہرایا کہ دشمنوں تک نے اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ

> ہندو اور مسلمان خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے افراد نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں .....
>
> پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان) میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہُوا تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کہ ابھی یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم

نہیں ہوئی تھی

(۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلبا سے خطاب)

اسی حقیقت کو انہوں نے (۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈز کالج پشاور کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں دہرایا کہ

> ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جب ان سے کہا گیا کہ مسلمان اس وقت اتنے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں اتنی پارٹیاں ہیں۔ ان میں علاقائی اور نسلی تفریقات بھی موجود ہیں۔ مجوزہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اس قدر طویل بُعد ہے۔ تو ان حالات میں وہ کونسی وجہ جامعیت ہے جو انہیں ایک قوم کے رشتہ میں منسلک کر دے گی۔ اس کے جواب میں انہوں نے (۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پر پہلے خود ہی یہ سوال کیا کہ

> وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس کی بدولت اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد ان اہم سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن۔ وہ رشتہ۔ وہ چٹان۔ وہ لنگر۔ خدا کی کتاب عظیم، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائینگے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائیگی۔ — ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ فلہذا، ایک اُمت۔

جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ جس اسلامی حکومت کے قیام کے لئے آپ ایک الگ مملکت کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس حکومت کی خصوصیت کیا ہوگی اور وہ اُس حکومت سے کس طرح مختلف ہوگی جو آزاد ہندوستان میں قائم کی جائے گی، تو انہوں نے (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے) کہا کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور

شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

مخالفت

عزیزانِ گرامی قدر! آپ غور کیجئے کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور اسلامی حکومت کے امتیازی نشان کے متعلق جو کچھ قائداعظمؒ نے کہا تھا اس میں کسی مسلمان کو ذرا سا بھی اختلاف ہو سکتا تھا؟ لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت (جیسا کہ علامہ اقبالؒ کے ساتھ ہوا) یہ مخالفت جہلا کی طرف سے نہیں تھی بلکہ (خیر سے) حضرات علماء کرام کیطرف سے تھی۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کے سلسلہ میں جو کتابیں اس وقت تک میری نظر سے گزری ہیں، ان میں اس کشمکش اور مخالفت کے متعلق وضاحت سے کچھ نہیں کہا گیا حالانکہ یہ اس تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ اس کشمکش کی تفصیل آپ کو طلوع اسلام کے اُس زمانے کے فائیل میں مل سکیگی۔ جمعیت العلماء، احرار، انصار، سرخ پوش، جماعتِ اسلامی، سب اس ہجوم مخالفت میں شریک تھے، اور مودودی صاحب، اُس حکومت کو جس کا امتیازی تصور آپ نے ابھی ابھی قائداعظمؒ کے الفاظ میں سن لیا ہے (کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہوگی) "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" کہہ کر پکارتے تھے۔

تشکیلِ پاکستان

بہرحال، ان تمام مخالفتوں کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا، اور ہم اپنے سفر کی نئی منزل میں داخل ہو گئے۔ اِدھر ہمارے ہاتھ میں پروانۂ آزادی تھا اور اُدھر جانبِ فلک سے ہمارے کانوں میں یہ آواز آرہی تھی کہ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ - (۱۰/۱۴)، آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بار پھر دہرا دوں کہ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، پاکستان کی بنیاد ان دو اساسی اصولوں پر تھی کہ

(۱) یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ مسلمان، اشتراکِ ایمان کی بنا پر، تمام غیر مسلموں سے الگ ایک منفرد قوم ہوتے ہیں اور کوئی غیر مسلم خواہ وہ اُس خطۂ زمین میں کیوں نہ بستا ہو، اِس قوم مسلم کا جزو نہیں بن سکتا۔ اور

(۲) پاکستان جس حکومت کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا ہے اس میں حکمرانی، قرآنِ حکیم کے اصول و احکام کی ہوگی۔

پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام عناصر جو اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، ایک

بنیادی تبدیلیاں

سیلاب کی طرح امڈ کر یہاں آپہنچے۔ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اس دو قومی نظریہ کو، جو اس کی بنیادی اینٹ تھی، لپیٹ کر الگ رکھ دیا گیا اور پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم تسلیم کر لیا گیا۔ "متحدہ قومیت" کا یہ تصور، جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا جس کے خلاف اقبالؒ نے آج سے نصف صدی پہلے آواز اٹھائی تھی جس کی دھجیاں پاش پاش کر کے قائداعظمؒ نے فضائے ہند میں اڑادی تھیں۔ جو ہمارے مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھا، جو ہمارے دعوائے ایمان کی صداقت کا ثبوت تھا جس کی بنا پر، اقبالؒ نے مولانا مدنی کو "بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی" اور جناحؒ نے مولانا آزاد کو کانگریس کا (SHOW BOY) کہا تھا، اس بائیس سال کے عرصہ میں، پاکستانی سیاست و مملکت کا ایک مسلّمہ اصول بن چکا ہے۔ یہاں (۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں) دو آئین مرتب ہوئے۔ ان دونوں میں، اسی متحدہ قومیت کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے حتیٰ کہ ان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے جداگانہ انتخاب کی شق بھی نہیں رکھی گئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ (پاکستان بننے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد) اس قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ جناحؒ خود بھی دل میں متحدہ قومیت کا قائل تھا اور اس نے دو قومی نظریہ کو، مطالبۂ پاکستان کے لئے، وکیلانہ حربہ کے طور پر آگے بڑھایا تھا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہمارے ہاں، ٹیلیویژن نے حال ہی میں (IN RETROSPECT) کے عنوان سے ایک سلسلۂ ملاقات شروع کیا ہے جس میں ان "بزرگانِ کرام" کو جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا، دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آئیں اور بتائیں کہ اس تحریک کی اصل و غایت کیا تھی اور انہوں نے اس میں کیا حصہ لیا تھا۔ اس سلسلہ کی تین شخصیتوں کے ارشادات ہم نے بھی سنے ہیں۔ مسٹر حسین امام، اور شاہ عزیز الرحمٰن اور چوہدری خلیق الزمان۔ ان سب نے یہی فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور، ہندو کی تنگ نظری نے پیدا کر دیا تھا۔ اگر وہ تھوڑی سی بھی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتا تو نہ ہم ان سے الگ ایک منفرد قوم کے ہونے کا دعوےٰ کرتے اور نہ ہی پاکستان کا مطالبہ پیش کیا جاتا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون!

چوہدری صاحب سے جب خاص طور پر پوچھا گیا کہ جس قسم کی مملکت کا تصور اس وقت آپ حضرات کر رہے تھے، اس کا تصور آپ حضرات کے ذہن میں کیا تھا، تو انہوں نے بہ تکرار یہ فرمایا کہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔ ہم بس تقسیم ہند چاہتے تھے۔ اور یہ کچھ اس وقت کہا جا رہا ہے جب قائداعظمؒ کی تقاریر اور ان کے بیانات ہنوز مطبوعہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں۔

اور آگے بڑھیے۔ جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات بڑے فخر سے دعوےٰ کرتے ہیں کہ دو قومی نظریہ سب سے پہلے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے پیش کیا تھا ـــــ یہ تو خیر ان حضرات کی نقلی ہے کہ

اس نظریہ کو مودودی صاحب نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یہ نظریہ کہ ــــ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ــــ اقبال کے اُس بانگِ درا میں موجود ہے جو اُس زمانے میں چھپ کر شائع ہوا تھا جب مودودی صاحب ہنوز کانگریسی اخبارات کے حلقۂ ادارت میں کام کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مودودی صاحب نے، اپنے قیامِ حیدرآباد کے دوران، متحدہ قومیت کے خلاف، اور دو قومی نظریہ کے حق میں مضامین لکھے تھے اور یہی مضامین ان کی مقبولیت کا باعث، اور ان کے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) آنے کا موجب بنے تھے۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ یہی مودودی صاحب، ۱۹۵۶ء کے اس دستور کو اسلامی قرار دے رہے ہیں اور اسے نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جو متحدہ قومیت کا علمبردار ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے (۱۹۶۳ء میں انتخابات کے سلسلہ میں) یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعت اسکی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اختلاف ہے۔ اس کے برعکس، اگر ایک ہندو، جمہوریت کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔
>
> (امروز ۲۰ مئی ۶۳)

یہ وہی "جمہوریت" ہے جسے مودودی صاحب مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

جب اسلام کو، جو مسلمانوں کے لئے وجہِ جامعیت اور ان کے ایک اُمت بننے کی بنیادی اینٹ تھا یوں اٹھا کر پھینک دیا گیا تو ان میں باہمی اختلافات کا ابھرنا فطری امر تھا۔ یہ اختلافات اُبھرے اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کی مثال اس سے پہلے شاید ہی کہیں مل سکے۔ سب سے پہلے بنگالی اور غیر بنگالی کا اختلاف، جو اب اختلاف سے آگے بڑھ کر تفریق و تقسیم کے مطالبات کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ پھر پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی وغیرہ کی نسلی تفریق جس نے اب عصبیتِ جاہلیہ کی سی شدت اختیار کر رکھی ہے۔ مذہبی فرقوں کی باہمی سر پھٹول جو اب معاشرہ کا معمول بن چکی ہے۔ پولیٹیکل پارٹیوں کی رسہ کشی جو ساری دنیا کے لئے تماشا بن رہی ہے ــــ معاشی بنیادوں پر طبقاتی کشمکش، جس میں جنون کے سے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف، تفریق، عصبیت، اور باہمی عداوت تو گروہ بندیوں کی سطح پر ہے۔ اگر ہم بہ نظرِ تعمق دیکھیں تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ پاکستان میں ہر شخص اپنی اپنی انفرادی زندگی بسر کر رہا ہے اور قوم کا تصور ہی کسی کی نگاہ میں نہیں۔ یہاں انفرادی اور نفسا نفسی کا جو عالم ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہاں ایک قوم نہیں بستی، بس افراد کا ایک ہجوم

ہے جن کی کیفیت قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ (۵۹/۱۴) دیکھنے میں وہ ایک جمعیت معلوم ہو گی لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہوں گے۔ یہاں ہر گروہ، ہر پارٹی، ہر فرقہ، بلکہ ہر فرد کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں جس نے یہ بستی انسانوں کی نہیں درندوں کا کبیٹ بن کر رہ گیا ہے جس میں ہر فرد، دوسرے کے خون کا پیاسا، اور ہر متنفس دوسرے کی جان کا لاگو ہے۔ گروہ بندانہ مفاد پرستی اور ہوسِ اقتدار اس قدر شدت اختیار کر چکی ہے کہ کچھ عجب نہیں اگر کل کو خود مملکت کے حصے بخرے کرنے کے سامان بھی تجویز ہونے لگ پڑیں۔ جب کسی قلب حساس کی چشم تصور اس کے نتائج و عواقب کو سامنے لاتی ہے تو اس کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اور بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے کہ

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

آپ نے کبھی غور بھی کیا ہے کہ اس تشتت و افتراق اور اس خلفشار و انتشار کی بالآخر وجہ کیا ہے؟ وجہ

اس کی وجوہات

ظاہر ہے۔ ہم نے اسلام کی بنیاد پر ایک قوم بننے کا دعویٰ کیا۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد نہ صرف یہ کہ اس دعویٰ کو عملی شکل دینے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ یہاں متحدہ قومیت قائم کر کے خود اپنے دعویٰ ہی کی تکذیب کر دی۔

جب ہم نے اسلام کے وجۂ جامعیت ہونے کے تصور کو خیر باد کہا تھا تو دیانتداری کا تقاضا تھا کہ (دنیا کی دوسری قوموں کی طرح) اشتراکِ وطن کی بنا پر، ایک قوم بنانے کے لئے ہی کچھ کرتے۔ لیکن ہم نے، اس کے لئے کچھ کرنا تو ایک طرف، اسے صاف صاف کہنے کی بھی جرأت نہ کی۔ دل میں ہم یہی کہتے رہے کہ قوم، وطن کے اشتراک سے بنتی ہے۔ اور زبان سے یہ دہراتے رہے کہ ــــ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ــــ اور ــــ اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے ــــ بالفاظ دیگر مسلمان ہم بن نہ سکے اور کھلے ہوئے کافر بننے کی جرأت نہ کی۔ نتیجہ اس کا عدم یقین، تذبذب، اور منافقت کا وہ جہنم ہے جس میں ہم سب جل رہے ہیں۔

———— (٠) ————

ایک جدید کشمکش

اب مطالبۂ پاکستان کی دوسری بنیاد کی طرف آئیے۔ یعنی یہ کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جس کا نظام اسلامی ہو۔ اس گوشہ میں جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہ شق اول سے بھی زیادہ جگر پاش، جاں سوز اور عبرت آموز ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مذہب پرست

طبقہ کے جو گروہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے وہ (بجز معدودے چند) ہجوم کرکے پاکستان آگئے۔ انہوں نے آتے ہی یہاں کے "مسٹروں" سے کہا کہ کیوں صاحب! پاکستان، اسلام کے نام پر، اسلام کے لئے حاصل کیا گیا ہے ناں؟ انہوں نے جواب میں لامحالہ یہی کہنا تھا کہ جی ہاں! اسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس پر ان مذہب کے اجارہ داروں نے کہا کہ پھر پاکستان کی زمامِ اقتدار ہمارے حوالے کرو۔ جو مذہبی علوم کے وارث ہیں۔ تم کیا جانو کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اب "مسٹر" بیچارے مشکل میں پھنس گئے۔ ان کی حالت یہ کہ نہ اگلتے بنے نہ نگلتے۔ جب وہ اس اسلام پر غور کرتے جس کے مدعی یہ اربابِ مذہب تھے تو وہ دیکھتے کہ اس سے، کوئی امتیازی مقام حاصل کرنا تو ایک طرف، ہم زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ دوسری طرف وہ اپنے احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کی بناء پر یہ کہنے کی جرأت بھی نہ کر سکے کہ آپ اپنا اسلام اپنے پاس رکھیے۔ ہم یہاں صحیح اسلام نافذ کرکے بتائیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مسٹروں کا طبقہ، دن بدن اپنے جذبۂ مرعوبیت کا شکار ہو کر دبتا چلا گیا، مذہب کے اجارہ دار انہیں دباتے چلے گئے —— اور قوم بیچاری چکی کے ان دو پاٹوں میں پستی چلی گئی۔

قانون سازی

جس اسلام کے عالم ہونے کے یہ حضرات مدعی ہیں، وہ اسلام کیا ہے۔ کب بنا۔ کیسے بنا۔ اور اس کی کیفیت و ماہیت کیا ہے؟ اس کے لئے بڑی تفصیل اور وقت کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت صرف اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ جس قسم کا اسلام ان حضرات کے پاس ہے، اگر اختیارات ان کے ہاتھ میں بھی دے دیئے جائیں تو کیا یہ لوگ اسے نافذ بھی کر سکیں گے؟ یہ سوال بڑا اہم اور غور طلب ہے اس لئے آپ کی خصوصی توجہ کا محتاج۔

دستورِ پاکستان میں جس شق کے داخل کرنے سے یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دستور اسلامی ہو جاتا ہے، یہ ہے کہ —— پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا ——

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ اس شق میں، یہ حضرات یہ استثناء بھی شامل کرتے ہیں کہ

جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے کتاب و سنت کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہوگی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان حضرات کے اسلام میں مختلف فرقے بھی علیٰ حالہٖ موجود ہوں گے اور شخصی معاملات کے لئے ہر فرقہ کے قوانین اپنے اپنے ہوں گے۔ میں پوچھنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کا یہ ذہنی تصور نہیں جس کی آزادی ہر سیکولر حکومت میں مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ آزادی ہمیں انگریزی حکومت میں بھی حاصل تھی اور اس کی ضمانت ہندو حکومت بھی دیتی تھی۔ اگر اسلامی حکومت اسی کا نام تھا تو اس کے لئے

جان جوکھوں میں ڈال کر ایک الگ مملکت قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

اور دوسری بات میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اُس زمانے میں جب اسلام اپنی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے آیا تھا — یعنی عہدِ رسالتمآبؐ میں — کیا اس وقت بھی یہی کیفیت تھی کہ امت میں مختلف فرقے موجود تھے۔ اور پرسنل لاز ہر فرقہ کے الگ الگ تھے ؟

کہا یہ جاتا ہے کہ پرسنل لاز تو ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے لیکن جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے وہ ساری مملکت کے لئے یکساں ہوں گے اور جب وہ کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے تو مملکت اسلامی بن جائے گی۔ آیئے ذرا اس دعویٰ کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔ لیکن اس وادیٔ پُرخار میں ذرا زیادہ احتیاط سے قدم رکھیئے گا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں کفر و الحاد کے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔

کتاب و سنّت

کتاب سے مراد ہے قرآن کریم۔ اور قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی قانون قرآنِ کریم کے مطابق ہو تو وہ تمام مسلمانوں کے لئے واجب التسلیم ہوگا اور متفقہ طور پر اسلامی کہلائیگا۔

لیکن سنت کی یہ صورت نہیں۔ آج دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں پوری کی پوری سنتِ رسول اللہ مندرج ہو اور وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کہ سنت کہتے کسے ہیں، یہ بھی تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ نہیں۔ یعنی سنت کی (DEFINITION) تک میں اختلاف ہے۔ حضرات اہل حدیث کے نزدیک، حدیث اور سنت میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی سنت، حدیث ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس، مودودی صاحب کے نزدیک۔

> سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ..... جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں

تحریف ہے۔ (رسائل و مسائل ۔ حصہ اوّل ۔ صفحہ ۳۱ و ۳۲ ؛ صفحہ ۲۲)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے اس نظریہ کی رُو سے سنت کی کیا پوزیشن سامنے آتی ہے ؟ یہ کہ :-

(۱) سنت اس طریق عمل کا نام ہے جو رسول اللہؐ نے بہ حیثیت رسولؐ اختیار فرمایا تھا۔
(۲) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں اس کی تصریح کہیں نہیں کی گئی کہ رسول اللہؐ نے کون سا کام بحیثیت رسول کیا تھا اور کونسا محض عادۃً۔
(۳) احادیث کے مجموعوں سے ایسے اعمال کو الگ کیا جانا چاہیئے جنہیں سنت کہا جا سکے۔
(۴) یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو (مودودی صاحب کی اصطلاح کے مطابق) "مزاج شناسِ رسولؐ" ہو۔ (جماعتِ اسلامی کے نزدیک یہ منصب خود مودودی صاحب کو حاصل ہے)۔

جمعیت اہل حدیث کے سابق صدر، مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم نے اس عقیدہ اور مسلک کے متعلق کہا تھا کہ

> یہ پوزیشن مضحکہ انگیز ہے۔ ہم آخری حد تک اس کی مخالفت کریں گے اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث صفحہ ۶۳)

اب آئیے احادیث کے مجموعوں کی طرف۔ یہ معلوم ہے کہ سُنّی حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں اور شیعہ حضرات کے اپنے۔ سُنّیوں کے نزدیک ان مجموعوں میں سے چھ ایسے ہیں جنہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے اور ان چھ میں سے دو (بخاری اور مسلم) ایسے جنہیں صحیح ترین کہا جاتا ہے۔ اہل حدیث حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ ان دونوں مجموعوں میں جو احادیث درج ہیں ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے، اور ملّت سے خروج کے مرادف۔ (ایضاً صفحہ ۱۳)۔ اس کے برعکس، حنفی حضرات، ان دونوں مجموعوں کی تقریباً دو سو احادیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اور مودودی صاحب کے نزدیک

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن ۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ ہے عزیزانِ من! خود ان حضرات کے نزدیک سنت کی پوزیشن۔ اب آپ سوچئے کہ یہاں کوئی آئین یا ضابطہ تو آئین ایسا بن سکتا ہے جو اس شرط کو پورا کرے کہ وہ "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں۔

جب "سنت" کا کوئی مجموعہ تو ایک طرف، سنت کی (DEFINITION) تک متفق علیہ نہیں اور نہ ہی احادیث کا کوئی مجموعہ ایسا ہے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہوں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے ہو سکے گا کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے یا اس کے مخالف۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ اسلامی نظام، اسلامی آئین، اسلامی قوانین کی جو اس قدر رٹ لگاتے رہتے ہیں، تو آپ مل بیٹھ کر ایک ایسا مجموعہ سنت مرتب کیوں نہیں کر دیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو اور اس میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہ ہو تو چونکہ اس کا جواب ان سے بن نہیں پڑتا اس لئے اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے شور مچا دیتے ہیں کہ یہ شخص منکر حدیث ہے۔ منکر شانِ رسالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ کوئی ایسا ضابطہ قانون بنایا ہی نہیں جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک "کتاب وسنت" کے مطابق ہونے کی شرط پوری کر سکے۔ انہوں نے دانستہ اس شرط کو عاید کر رکھا ہے کہ نہ نو من تیل ہو نہ رادھا ناچے۔ یہ جانتے ہیں کہ اگر اسلام کا کوئی متفق علیہ ضابطہ مرتب ہو گیا تو ان کے لئے اس کی گنجائش نہیں رہے گی کہ جس بات کو چاہا اسلام کے مطابق کہہ دیا اور جسے چاہا اس کے خلاف۔ اور اس طرح امت میں خلفشار پیدا اور ملک میں فسادات برپا کراتے رہے۔ ان حضرات کی اسی ذہنیت اور کوشش کے پیش نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

کارِ ملا فی سبیل اللہ فساد!

قرآن کے خلاف اعتراض

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سنت اور احادیث کے معاملہ میں آپ حضرات میں اس قدر اختلافات ہیں، تو آپ قرآن کو قانون کی اساس کیوں نہیں تسلیم کر لیتے، جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، تو ان کی طرف سے جواب یہ ملتا ہے کہ قرآن کا متن بے شک متفق علیہ ہے لیکن اس کی تعبیرات میں اختلاف ہے۔ اس لئے عملاً وہ بھی متفق علیہ نہیں۔

ان کے اس جواب کی رُو سے سوچئے کہ بات کیا ہوئی۔ یہ کہ

(۱) سنت کا کوئی مجموعہ ہی موجود نہیں۔

(۲) احادیث کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جو ان سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) قرآن کا متن متفق علیہ ہے لیکن اس کی تعبیرات میں اختلاف ہے۔

تو آپ بتائیے کہ کیا (ان حضرات کے اس موقف کے مطابق) پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے جو متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے؟ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، یہ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں اور

یہ اس پوزیشن کو دانستہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف، ہمارے ہاں مکے آئین مرتب کرنے والوں سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی لیکن وہ بھی اسی میں مصلحت سمجھتے رہے کہ اس پوزیشن کو علیٰ حالہٖ رکھا جائے۔

دونوں کے دل میں چور ہے، بیٹھے ہیں سامنے
وہ دل لئے ہوئے، میں تمنا لئے ہوئے

اس غیر متعین، مبہم اور ناممکن العمل کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک فسادات کی مستقل آماجگاہ بن رہا ہے۔ کوئی معاملہ سامنے آئے۔ ایک گروہ پکار اٹھتا ہے کہ یہ غیر اسلامی ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں یہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ دونوں گروہ اپنے اپنے متبعین کو "خدا اور رسول" کے نام پر "جہاد" کے لئے اکساتے ہیں اور بات، گالی گلوچ سے شروع ہو کر قتل و غارت گری تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ ہے ملک میں تشتت و افتراق، خلفشار و انتشار، فسادات و تصادمات، نفسانفسی، اور افراتفری، شورش انگیزی اور خوں ریزی کی حالت۔ اور قیامت بالائے قیامت، کہ قوم میں یا تو کوئی سنجیدہ طبقہ باقی ہی نہیں رہا جو مل بیٹھ کر سوچے کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔ اور اگر کوئی طبقہ ایسا ہے تو وہ (INDIFFERENT) ہو کر بیٹھ گیا ہے اور یہ کسی قوم کی بدقسمتی کی انتہا ہوتی ہے کہ اس کا اہل فکر و نظر سنجیدہ طبقہ اس طرح مایوس ہو کر، ملی مسائلِ حیات سے لاتعلق ہو جائے۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں ہماری یہ عید آ رہی ہے! کچھ اسی قسم کے تھے وہ حالات جن سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

امید کی کرن

حالات ہر چند بے حد تاسف انگیز اور حوصلہ شکن ہیں لیکن جس امت کے پاس قرآن جیسا سرچشمۂ حیات ہو، اس کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن ہمیں زندگی کے ہر گوشے میں راہ نمائی دیتا ہے اور جو اس کی عطا کردہ راہ نمائی کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے وہ کبھی ناکام نہیں رہتا۔ میں عزیزانِ من! قرآن کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ میں نے عمر کا بیشتر حصہ اس کتابِ عظیم میں غور و فکر میں بسر کیا ہے اور گزشتہ تیس سال سے مسلسل و پیہم، امت کے ان اجتماعی مسائل کے متعلق سوچتا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں جن سے ہم اس وقت دوچار ہیں۔ مجھے اس باب میں قرآن اور تاریخ سے جو راہ نمائی ملی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ احباب کے سامنے، کھلے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں۔ اس لئے بھی کہ میں اب عمر کی

اس منزل میں پہنچ رہا ہوں جہاں کہنے کی بات کو فرصت کے کسی دوسرے موقعہ پر انتظار رکھنے کا (RISK) نہیں لینا چاہیئے۔ میں عزیزانِ من! اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

(۱) اسلام کا احیاء تو ایک طرف، اس کا سمجھنا بھی ہمارے مذہب پرست طبقہ کے بس کی بات نہیں۔ یہ اس لئے کہ جس اسلام کے یہ وارث اور عالم کہلاتے ہیں، وہ اسلام وہ دین نہیں جسے خدا نے نازل کیا اور اس کے رسولؐ کافۃً للناس نے قائم کر کے دکھایا، یہ اسلام وہ مذہب ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت اور سرمایہ داری میں وضع ہوا۔ اور جسے سند قرآن کی نہیں، بلکہ صرف تاریخ کی حاصل ہے۔ مذہب میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ افراد کا ذاتی معاملہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ جو ہم اپنی نمازوں، عیدوں اور حج میں اجتماعات دیکھتے ہیں تو یہ دین کے بے جان پیکر ہیں۔ ان میں اول تو کوئی مقصد ہی سامنے نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا ہے تو ہر ایک کے پیشِ نظر اپنی اپنی نجات کا سوال ہوتا ہے۔ امت کے اجتماعی مسائل کسی کے سامنے نہیں ہوتے۔ لہٰذا، اسلام صرف اس وقت زندہ ہو سکیگا جب مذہبی پیشوائیت باقی نہ رہے۔

(۲) دین میں، مذہبی فرقوں کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اس میں ساری امت، ملتِ واحدہ ہوتی ہے۔ فرقوں کا وجود مذہبی پیشوائیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت مٹ جاتے تو فرقے بھی باقی نہیں رہتے۔ اُس وقت ہر شخص اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتا ہے۔

(۳) دین میں، رنگ، زبان، نسل، جغرافیائی حدود کی بنا پر امتیازات باقی نہیں رہتے۔ اس میں وجہ جامعیت، اشتراکِ ایمان ہوتا ہے۔ اور بس۔

(۴) دین میں سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ اس میں ساری قوم کے لئے ایک نظامِ حکومت ہوتا ہے اور ایک مرکز۔ دین کے تصور کی رُو سے، دنیا میں دو ہی پارٹیاں ہوتی ہیں ـــــ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان۔

(۵) دین میں، اطاعت خدا کے احکام و قوانین کی ہوتی ہے جنہیں اس نے اپنی کتابِ عظیم میں بنہایت وضاحت سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

(۶) قرآن میں، بجز معدودے چند تفصیلی احکام کے، دین کے اصول دیئے گئے ہیں اور مستقل اقدارِ حیات۔ یہ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دور کی امت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ لازماً ان تفصیلات سے استفادہ کرتی ہے جو اس سے پہلے اپنے اپنے زمانے میں، ان کے پیشروؤں نے مرتب کی تھیں۔ یہ قوانین حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں رجوع بھی اسی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کیلئے

عملی طریق کار کیا ہوتا ہے، اسے ہر دور کی حکومت خود متعین کرتی ہے۔

(۷) دین کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم رہے نہ محتاج۔ انسانوں کی محکومی تو یوں ختم ہو جاتی ہے کہ اس میں اطاعت خدا کے احکام و اصولات کی ہوتی ہے۔ محتاجی کے ختم کرنے کے لئے وہ ایسا معاشی نظام قائم کرتا ہے جس میں ذرائع رزق، کسی فرد، گروہ یا اربابِ حکومت کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، امت کی تحویل میں رہتے ہیں تاکہ ان سے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔ ذاتی ملکیت کے اس طرح ختم ہو جانے سے، وہ تمام خرابیاں اور جرائم خود بخود نیست و نابود ہو جاتے ہیں جو ارتکازِ دولت اور جذبۂ استحصال (EXPLOITATION) کا فطری نتیجہ ہیں۔

(۸) اس طرح ہر فرد جب آزاد اور مستغنی عن الغیر ہو جاتا ہے، تو اس کے لئے مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔ اس سے اس کی ذات ایسی نشوونما حاصل کر لیتی ہے جس سے وہ موجودہ زندگی سے اگلی زندگی کی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس امت کے افراد کی یہ دنیا بھی حسین اور خوشگوار ہو جاتی ہے اور آخرت بھی سرسبز و شاداب!

یہ ہے، عزیزانِ من! وہ اسلامی نظام جس کے قائم کرنے کے لئے مملکتِ پاکستان کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی تھی وہ حقیقتِ کبریٰ جس کی وضاحت کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ اس مملکت میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اسلام سے اس ٹھپہ کو دور کر سکیں جو ہماری ملوکیت نے اس پر لگا دیا تھا۔ اور قائداعظمؒ نے ایک طرف، زمینداروں اور جاگیرداروں کو متنبہ (WARN) کیا تھا کہ ہمارے لئے پاکستان میں کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اور دوسری طرف، ببانگِ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ یہاں مذہبی پیشوائیت کی حکومت (تھیاکریسی) قائم نہیں ہو سکیگی۔ اس قسم کا صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے جس قسم کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ، اور ہمتِ بلند کی ضرورت ہے، وہ ظاہر ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جس میں عید اس معیار پر پوری اترے گی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ —— عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں —— یاد رکھئے! اسلامی نظام اسی کا نام ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

بزمِ مذاکرہ

منعقدہ ——— ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء ۔ بروز ہفتہ ۔ بوقت ۲½ بجے دوپہر

موضوع ——— "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی"

——— زیرِ صدارت ———

محترمہ ثریّا عندلیب صاحبہ

شرکائے بزم

(۱) ——— صالحہ نغمی ——— طالبہ جماعت ہشتم

(۲) ——— محمد جاوید ——— طالب العلم جماعت نہم

(۳) ——— خالد سلام ——— پروفیسر علم الارض ۔ انجینئرنگ یونیورسٹی ۔ لاہور

(۴) ——— خالدہ ملک ——— طالبہ سیکنڈ ایئر

(۵) ——— تنویر ظہور ——— طالب العلم بی ۔ اے

(مقالہ پنجابی زبان میں تھا اسلئے شائع نہیں کیا جا رہا ——— معتمد)

(۶) ——— مسرت چغتائی ——— ایم ۔ اے (فلسفہ) ۔ (مقالہ انگریزی میں تھا اسکا رواں ترجمہ شائع کیا جاتا ہے)

(۷) ——— غلام صابر ——— ایم ۔ اے (اردو)

(۸) ——— نوشابہ ——— بی ۔ اے

(۹) ——— محمد بشیر ظفر ——— ایم ۔ اے (اردو) (قلتِ وقت کی وجہ سے مقالہ پڑھا نہیں گیا تھا)

(۱۰) ——— عارفی سلطانہ ——— ایم ۔ اے (اردو) ۔ ایم اے فلسفہ ۔ ریسرچ سکالر "قرآن و فلسفہ اقبال"

(برجستہ تقریر)

(۱۱) ——— نجمہ کوثر ——— بی ۔ اے ۔

(۱۲) ——— سلمٰی پرویز ——— بی ۔ اے

افتتاحیہ

محترمہ صدر مذاکرہ

میرے عزیز بھائیو اور پیاری بہنو! السلام علیکم۔

میں اپنے روحانی باپ محترم پرویز صاحب کی تہ دل سے شکرگذار ہوں کہ انہوں نے اس بلند پایہ علمی مجلس کی صدارت کے اعزاز کے لئے مجھے منتخب فرمایا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں اس عزت کی مستحق تھی لیکن اگر مجھ میں فی الواقعہ کوئی ایسا جوہر ہے جس کی وجہ سے ان کی نگہ۔ انتخاب مجھ پر پڑی ہے تو میں اس حقیقت کے اعتراف و اعلان میں فخر محسوس کرتی ہوں کہ وہ بھی انہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے اور ان کی یہ نگہ عاطفت مجھ تک ہی محدود نہیں، اس وقت جتنے بچے اور بچیاں آپ کے سامنے آئینگے اسی چمنستان کے پھول اور کلیاں ہیں۔

شمعِ خیال، فکر کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں اسی محفل سے آئے ہیں!

دعا ہے خدا ان کی شفقت کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔

معزز خواتین و حضرات! آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آپ جانتے ہیں اور یہ بھولنے والی بات نہیں کہ دو سال قبل اسی پلیٹ فارم سے ہم نے نمودِ سحر کے آثار کی نشاندہی کرتے ہوئے بانگِ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ فضائے انسانیت پر چھائے ہوئے گھٹاٹوپ اندھیرے چھٹ جائینگے اور بالآخر سحر ہو کے رہے گی۔ اور اس کے بعد گئے سال ہمیں نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرنے کا پیغامِ سعید ملا جس کو ہم نے اسی قرآنی اجتماع میں سب کے سامنے اپنے دل و دماغ کی آمادگی اور اپنی فکر و نظر کی رضامندی کے ساتھ ہوش و خرد کی موجودگی میں بطیبِ خاطر قبول کیا۔ یعنی بالفاظِ دیگر ہم نے نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کا عہد کیا اور یہ اقرار کیا کہ یہی ہمارا مدعائے زندگی ہے اور یہی ہونا چاہیئے ہمارا نصب العین حیات۔

اس عزمِ صمیم کے بعد عملِ مسلسل کی باری تھی۔ ایک سال اور گذر گیا ہے۔ اس تمام عرصے میں ہم میں سے کتنوں نے اس راہِ حق پر چلنے کا آغاز کیا اور کتنے اپنے کہے پر پورے اُترے۔ دیانت و صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوال کا جواب ہم خود اپنی ذات سے حاصل کریں اور اپنا محاسبہ آپ کریں۔ تاہم نیا زمانہ نئے صبح و شام پلک جھپکنے میں نہیں پیدا ہو جایا کرتے۔ زندگی کا یہ سفر بڑا پُرخطر ہے۔ اس میدانِ عمل میں تپتی اور طویل راہوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس جادہ پیمائی میں دم لینے کے لئے جگہ جگہ رُکنا بھی پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کھڑے ہو کر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کہیں غلط قدم تو نہیں اُٹھ گیا، ہم کسی غلط طرف تو نہیں بہک گئے۔ بہرحال نئے صبح و شام پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا لینے کے بعد ہمیں ترجمانِ حقیقت حکیم الامت اقبالؒ کے اس قولِ فیصل کو ہر آن پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آج اسی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہمارا کاروانِ قرآنی اپنے اس متعین پڑاؤ پر رُکا ہے جہاں ہر سال رُک کر ہم تازہ دم ہوتے ہیں اور مزید آگے بڑھنے کے لئے نیا پروگرام تشکیل دیتے ہیں۔ آج ہمیں زندگی تیشہ و سنگِ گراں اور رواں دواں جوئے شیر کی تصویر دکھا رہی ہے لیکن اس تصویر کو دیکھنے کے لئے شرط یہ ہے کہ ہم اپنی چشمِ بصیرت کو وا کریں اور دیدۂ بینا سے کام لیں کیونکہ ہماری یہ ظاہری کھُلی آنکھیں سطح کے نیچے کچھ نہیں دیکھ پاتیں، اور حقائق کی تہہ تک نہ پہنچ سکنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی ہمارے لئے ایک معمہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا بن کے رہ جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے کسی دیوانے کا خواب قرار دے کر اپنی دانست میں ہم گویا زندگی کا پہاڑ سر کر لیتے ہیں۔ یوں دیکھئے تو اللہ تعالیٰ کی اس وسیع و عریض دنیا میں جب سے حضرتِ انسان کا نزول ہوا ہے زندگی کا دقیق مسئلہ اور حیات کا عمیق فلسفہ اپنے اپنے دَور کی ذہنی سطح کے مطابق اس کے زیرِ غور رہا ہے، اور افراد و اقوام نے مختلف تجربات کی بنا پر زندگی کے متعلق مختلف نظریات پیش کئے ہیں لیکن جیسا کہ انسانی ذہن کے خود ساختہ تصورات کے نصیب میں قیام و ثبات نہیں ہوتا، یہ نظریات بھی بنتے مٹتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ اگرچہ ازل سے تا امروز جاری ہے مگر اس کشمکشِ حیات پر غالب آنے کے لئے ہمیں یہ خوشبختی یعنی رحمتِ خداوندی حاصل ہے کہ ہمارے پاس ہمارے درمیان وہ الحق موجود ہے جو زندگی کے بارے میں ایسا غیر مبہم، واضح اور دوٹوک فیصلہ دیتا ہے کہ اس کے بعد ہماری دنیائے انسانیت کے لئے کسی قسم کے شکوک و شبہات اور ظن و توہمات کا تاریک زندان باقی نہیں رہتا۔

یہ الحق یعنی کلام اللہ قرآنِ حکیم واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ زندگی مسلسل جہاد کا نام ہے۔ زندگی پیہم حرکت سے عبارت ہے۔ زندگی سرفرازیاں اور خوشگواریاں چاہتی ہے۔ زندگی جمود و تعطل سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ زندگی حقائق سے فرار نہیں سکھاتی۔ زندگی محنت سے جی چرانے اور ذمہ داریوں سے گریز کی راہیں

نکالنے کو نہیں کہتے۔ زندگی تو سراپا سعی و عمل ہوتی ہے۔ اسی سعی و عمل کا دوسرا نام تیشہ و سنگِ گراں ہے جس سے نبرد آزما ہو کر ہی وہ جوئے شیر نکلتی ہے جو تشنہ لبوں کو جامِ شیریں مہیا کرتی اور یوں زندگی کو جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں بناتی چلی جاتی ہے۔

زندگی زندہ رہنے سے مراد ہے اور جب کسی قوم کے دل میں زندہ رہنے کی آرزو بیدار ہوتی ہے تو وہ ارفع و اعلیٰ مقاصدِ حیات کے ہمراہ جانبِ منزل گامزن ہو جاتی ہے اور اس راستے میں جو بھی رکاوٹیں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتی ہیں وہ اس کے تیشۂ ایمان کی ضربوں سے پاش پاش ہو جاتی ہیں۔

زندگی تو انسانی اقتدار کی درخشانی کو کہتے ہیں جو فرائض کی ادائیگی سے جنم لیتی ہے۔ برعکس اسکے وہ لوگ جو زندگی کی راہ میں سہل انگاری اور تن آسانی چاہتے ہیں اور زمین کا سخت پتھر جیسا سینہ چاک کئے بغیر سونے کو پا لینا چاہتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو حبطت اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت کا خسران جنکا مقدر بن جاتا ہے۔

زندگی کی جوئے شیر یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جایا کرتی اس کے لئے لازماً تیشۂ ایمان و عمل سے کام لے کر سنگِ گراں کو کاٹنا پڑتا ہے۔ بڑے جانگداز مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ اس میں مستقل استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے پروردگارِ عظیم قرآنِ کریم میں بار بار فرماتا ہے کہ کہیں تم ایسا نہ سمجھ لینا کہ تمہیں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر جنت مل جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ؕ

وحی کی راہ نمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے لیکن چونکہ اس سے انفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے اسلئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اس جنتی معاشرہ کے قائم کرنے کے لئے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سو اے جماعتِ مومنین! تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس معاشرہ کو یونہی قائم کر لو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکیگا۔ تمہیں بھی ان صبر آزما گھاٹیوں سے واسطہ پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالٰہا ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ایسے ہمت شکن مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب

ہوتیں اور تائیدِ ایزدی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔ تم بھی ان مرحلوں سے چھوٹ نہیں سکتے پھر اعلان ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

اگر تم اس خیالِ خام میں مگن رہو کہ محنت و کاوش کئے بغیر تمہیں کامرانیوں اور شادابیوں کی جنتی زندگی مل جائے گی تو یہ تمہاری کتنی بڑی بھول ہوگی۔ یہ جنت، یہ جوئے شیر حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور باطل کے ساتھ ٹکراؤ میں ثابت قدم رہتا ہے۔ سورۃ توبہ میں یوں فرمایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

اے جماعتِ مومن! کیا تم سمجھ رہے ہو کہ چونکہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا ہے اس لئے اب تمہارے لئے سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جائے گا اور تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہ ہوگی تو یہ خیال باطل ہے۔ تمہارے دعویٰ ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے مصروفِ تگ و تاز رہتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے علاوہ اور کسی کو اپنا دوست اور رازدار نہیں بناتا۔ یاد رکھو! خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ فقط ایمان کا دعویٰ کافی نہیں ہوتا۔ سورۃ عنکبوت میں ایمان کے ساتھ عمل کی اہمیت کو یوں واضح کیا گیا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۔

کیا یہ لوگ ایسا سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں انہیں چھوڑ دیا جائیگا۔ کہ اب جو جی میں آئے کرو تم نے مطالبہ پورا کر دیا ہے۔ ان کا ایسا سمجھنا سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ان سے پہلے جن لوگوں نے ہمارے قانون کی صداقت کا اقرار کیا وہ محض زبانی اقرار سے چھوٹ نہیں گئے۔ انہیں کشمکشِ حق و باطل کی کٹھالی میں تپایا گیا تاکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ ان میں سے کون اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور کون عمل میں پورا نہ اتر کر اس کی تکذیب کرتا ہے۔ اس کے بعد فرمانِ الٰہی یہ ہے

کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ کامیابی کا حصول مسلسل جدوجہد اور بڑی قربانیوں سے ہوتا ہے۔ جو لوگ اس توقع پر سختیاں جھیلنے اور مصائب برداشت کرتے ہیں کہ انہیں قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہے اور وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے حضور جواب دہ ہیں ان سے کہہ دو کہ جس انقلاب کے لئے یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں وہ آکر رہیگا۔ جس جوئے شیر کے لئے وہ کوہ کنی کر رہے ہیں وہ ضرور برآمد ہوگی۔ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور پھر صلاحیت بخش کام کرتے ہیں تو اس سے ان کی اپنی ذات اور معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جاتی ہیں اور ان کے اعمال کا بدلہ نہایت حسن کارانہ انداز سے ملتا ہے۔

یہ ہے وہ وعدۂ حق جو رب العالمین نے اپنے ان بندوں سے کیا ہے جو اس کی ہدایت کے مطابق زندگانی کی حقیقت کو سمجھ کر تیشہ و سنگِ گراں سے کبھی گھبراتے نہیں اور اول و آخر اس فرض کو ادا کرتے ہیں۔ وہ اس محکم خدائی اصول کو جانتے ہیں کہ جیتا وہی ہے جو حق کی راہ میں مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب اس راہِ حق میں باطل کے ساتھ ٹکراؤ کا سنگین وقت آجاتا ہے اور آناً فاناً دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امڈ آتے ہیں وہ ساعت کیسی ہوتی ہے کہ جس سے خوف کے مارے آنکھیں بند ہونے لگیں اور دہشت سے دل یوں دھک دھک کرنے لگیں گویا وہ اچھل کر حلق تک آپہنچیں گے اس لرزا دینے والی مصیبت کی گھڑی میں ان مومنین کا جذبہ صادقہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور دیکھنے والے دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کس پامردی اور حوصلہ مندی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اور کس طرح فی سبیل اللہ جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ستمبر ۶۵ء کے جاں نثار شہدا و غازی وہی اللہ کے بندے تھے جنہوں نے جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی کی جگمگاتی حقیقت کو حرفاً حرفاً سچ کر دکھایا اور اپنے نقوشِ قدم پر چلنے والوں کے لئے مثالِ لازوال چھوڑ گئے۔

قرآن کا فرمان ہے کہ اس زندگی کے اندر قدم قدم پر تخریبی اور تعمیری قوتوں کا تصادم ہوگا انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی تعمیری قوتوں کو تخریبی قوتوں پر غالب رکھے۔ یہی جہادِ زندگی ہے اور جو قوم اس جہاد سے منہ موڑتی ہے اس کا انجام قرآن ہی کی زبان میں سنیئے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔

یعنی اگر تم اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے باہر نہیں نکلو گے تو اس کا نتیجہ بڑا الم انگیز ہوگا اور وہ یہ کہ خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئیگا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں کی حامل زندگی اس قوت کی متقاضی ہوتی ہے جو جمعیت سے پیدا ہوتی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اس جمعیت سے مقصود سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا ہے کہ یہی منشائے ایزدی ہے۔ یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمزِ زندگی ہے۔ یہی مطلوبِ شریعت ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور والّذین معہٗ اور السابقون الاولون کا عہد مبارک سب کا سب اسی تابندہ حقیقت کا آئینہ دار تھا کہ جب ایمان و عمل کے ساتھ اتحاد و اتفاق شامل ہو جاتا ہے تو جماعت مومنین کی زندگی کا ہر سنگِ گراں ان کی خاکِ پا بن جاتا ہے۔ پھر اسی خاک سے وہ چشمے پھوٹتے ہیں جنہیں قرآن پاک نے تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ سے تعبیر کیا ہے اور یہ ہے "فوزِ عظیم" کی وہ منزلِ ابدی جہاں اللہ کے وہ بندے پہنچتے ہیں جو اس کے نظام کو قائم کر کے اس کے رفیق بنتے ہیں۔ اس روشِ زندگی سے ان کو نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے نہ کسی داخلی کشمکش سے اندوہ ناکی ہوتی ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے جو کبھی بدلا نہیں کرتا اور اس طرح اللہ اس محکم نظریہ زندگی کی رو سے ایمان و عمل والوں کی جماعت کو ان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی دونوں میں ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ۔ تو میرے عزیز بہن بھائیو! یہ ہے قرآن کی روشنی میں میری سمجھ کے مطابق "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی" کا مفہوم جو میں نے آپکے سامنے پیش کیا۔ واللہ المستعان!

عزیزہ صالحہ نعیمی

زندگی

السلام علیکم! صدرِ محترم اور معزز سامعین،

"جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی"

جب سب سے پہلے میں نے علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ سنا تو میں نے اس پر یہ سوچ کر یقین کر لیا کہ ٹھیک ہے یہ الفاظ صحیح ہی ہونگے کیونکہ ہمارے بزرگوں کے کہے ہوئے الفاظ صحیح ہی ہوا کرتے ہیں۔

اس وقت میں نے ان الفاظ کو اپنی حقیقی زندگی میں جانچا تو لا نہیں تھا اور ان کی اصلیت نہیں پہچانی تھی مگر چند ہفتے قبل میں نے ایک انگریزی فلم فیچر دیکھی جس میں انسانوں کی جد وجہد دکھائی گئی تھی۔ مجھے ڈاکٹر اقبالؒ کے اس مصرعے کا خیال آیا اور میرے دل نے کہا کہ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہی زندگی ہے۔

اس فلم میں بعض فوجیوں کو ایک ریگستان میں پانی کی تلاش کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ دکھایا گیا کہ کچھ دیر بعد انہیں ایک پرانا کنواں مل گیا۔ اب وہ بہت جد وجہد کر کے نیچے اتر رہے تھے۔ انہیں یہ دیکھنا تھا کہ پانی ملتا ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے پانی پالیا۔ یہی واقعہ علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے کی وضاحت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور جگہ پر یہ دکھایا گیا کہ برف سے ڈھکا ہوا ایک عمودی پہاڑ ہے اور لوگ اس پر رسیوں کے ذریعے چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں پر بھی اس مصرعے کا مطلب ظاہر ہوتا تھا کیونکہ اس میں انسانوں کی کوشش دکھائی گئی تھی اور ان کی امید اور مایوسی کی حالت دکھائی ہوئی تھی کہ کیا معلوم وہ اپنی منزل پر پہنچتے ہیں یا نہیں۔

اقبالؒ کے اس مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی سعی و عمل کا نام ہے۔ تم کوشش کئے جاؤ اور ہمت نہ ہارو اس جد وجہد کا پھل تمہیں یوں ملے گا کہ تم کامیاب ہو گئے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تمہیں یہ کامیابی اسی دنیا میں نصیب ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کامیابی تمہیں اگلی دنیا میں نصیب ہو۔ مثال کے طور پر ایک مجاہد حق کی خاطر اللہ کی راہ میں آخری دم تک لڑتا ہے اور پھر شہید ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی، اسے جنت میں جگہ مل جائے گی اور یوں اس کو اس کی جد وجہد کا پھل مل جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے بالکل سچی بات کہی ہے اور اگر ہم غور کریں تو ہمیں دنیا میں ہر ہر قدم پر اس کا ثبوت ملتا ہے۔ جو انسان بھی کسی اچھے مقصد کے لئے زندگی میں سعی و عمل کرتا ہے وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ ہمیں بھی ایسا کرنا چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی کو .... کسی اچھے مقصد کے لئے وقف کر دیں اور ہمیشہ اس مقصد کے حصول کے لئے جد وجہد جاری رکھیں۔ جب ہم اپنی منزل کو پالیں تو ہم دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں۔ ہم زندگی کے کسی بھی شعبے میں اچھے مقصد کے لئے کوشش کر سکتے ہیں مثلاً سائنس کے میدان میں ہم نئی نئی ایجادیں کر کے انسانیت کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

میں آپ کو سائنس دانوں کی ایک مثال دیتی ہوں۔ تین سائنس دان انسان کی طرف سے چاند پر پہنچ چکے ہیں۔ ناواقف شخص کے لئے یہ آسان بات ہے۔ سائنس دان خلائی جہاز میں بیٹھے اور چاند پر پہنچ گئے اور پھر خلائی جہاز ہی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔ قصہ ختم! ــــ لیکن حقیقت میں ان کو چاند پر جانے

سے پہلے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب سے پہلے تو خلائی جہاز بنانے میں بڑی دقتیں پیش آئی تھیں۔ اس کے تین حصے بنانا۔ چاند گاڑی بنانا وغیرہ اس میں شامل تھا۔ پھر یہ مشکل پیش آئی کہ چاند پر جائے گا کون؟ بہت غور و فکر کے بعد ان تین افراد کو چنا گیا مگر بات یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ اب تو سب سے ضروری مرحلہ سامنے تھا ان سائنس دانوں کو چاند پر جانے کے لئے TRIANING دینی تھی۔ اس میں کئی قسم کے کام سیکھنے تھے اور مختصراً وہ بہت ہی سخت TRAINING تھی۔ لیکن پھر خدا تعالےٰ نے ان کو ان کی جد و جہد اور محنت کا صلہ یہ دیا کہ وہ چاند کو سر کر سکے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ کی سچائی کہ زندگی جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

انسان کے لئے کچھ نہیں اس کے سوا جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان جس چیز کے لئے کوشش کرتا ہے اسی کا پھل اُسے ملتا ہے۔ چنانچہ جب خدا کا بھی یہ فرمان ہے تو ہمیں اپنی زندگی انہی اصولوں کے تحت گزارنی چاہیئے۔

یاد رکھیئے! جو شخص بھی اپنی زندگی میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ زندگی بھی اس کے لئے دوزخ بن جاتی ہے اور آخرت میں بھی اس کو دوزخ ملتی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی کے لئے کسی شعبے کا انتخاب کر لیں اور پھر اس میں ترقی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد شروع کر دیں اور جب تک اس کو پا نہ لیں اس کوشش کو جاری رکھیں جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے دین، اسلام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے زندگی بھر سعی و عمل کرتے رہے اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

اگر ہم بھی اپنی زندگی میں اپنے مقصد کے لئے جد و جہد جاری رکھیں تو ہم بالکل صحیح اور خدا کے دیئے ہوئے احکام کے مطابق زندگی گزاریں گے اور دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ہمیں جنت کی خوشیاں نصیب ہونگی۔

عزیز محمد جاوید

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

صدرِ گرامی!

مجھے بتایا گیا ہے کہ فرہاد نامی ایک شخص نے حصولِ مقصد کی خاطر پہاڑ جیسی سخت چیز کاٹ کر رکھ دی تھی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ فرہاد صاحب نے ایسا انوکھا کام کرنے کے لئے اپنے والدین سے اجازت اور سکول سے چھٹی کس طرح لی ہوگی۔ اور اگر وہ ان دونوں بندشوں سے آزاد تھا تو پھر اُس نے کون سا تیر مارا!

فرہاد کا یہ معرکہ اس لئے بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں کہ مقصد اس کا متعین تھا، تیشہ اسکے پاس موجود تھا اور مقابلہ تھا اُس کا بے جان پتھروں سے۔ جبکہ ہماری حالت یہ ہے کہ نہ مقصد کا پتہ، نہ تیشے کی خبر اور نہ دشمن کی پہچان۔ اور اس پر بھی منتظر ہیں جوئے شیر کے۔ شاید اس لئے کہ مایوسی گناہ ہے۔ ورنہ مجھے بتایئے تو سہی کہ وہ کون سا مقصدِ حیات ہے جو آپ نے ہم بچوں کے لئے متعین کیا ہے؟ — جی ہاں! پچھلے سال آپ نے — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرنے کا ضرور کہا تھا — لیکن اِسی اسٹیج پر جب میرے چھوٹے بھائی نے اس راہ میں حائل مشکلات کی نشاندہی کرتے ہوئے، بطورِ تیشہ آپ سے ایک درسگاہ کا مطالبہ کیا، تو یاد ہے آپ نے یوں چپ سادھ لی تھی۔ جیسے اُس نے نَو من تیل مانگ لیا ہو۔

بظاہر اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو ہماری روایتی بے حسی جس پر ہمیں ناز بھی ہے اور دوسری یہ کہ آپ اپنے بچوں کے ہاتھ میں کوئی ایسا تیشہ دینا ہی نہیں چاہتے جس کی چوٹ خود آپ کے اپنے تراشے ہوئے پتھروں پر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ جی ہاں! عقلِ خود بیں اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی اور زندگانی کا یہی وہ تاریک گوشہ ہے جسے منوّر کرنے کے لئے ایک سحر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ وہی سحر ہے جس کی ضیا سب سے پہلے مفکرِ قرآن جناب پرویز کے ذہنِ رسا میں اُبھری۔ اور یہ مدھم لَو اب شعلۂ آفتاب بن کر "طلوعِ اسلام" کالج کی صورت میں نمودار ہو رہی ہے۔

صدرِ گرامی! تیشہ ایک اہم ضرورت ہے اور دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ جہادِ زندگانی میں تعلیم سے بہتر کوئی تیشہ نہیں۔ لیکن یہ تیشہ، تعلیم کبھی کبھی (اور آج کل عام طور پر) ظلم کی تلوار کیوں بن جاتا ہے اور غرور و نخوت کا عصا کیوں؟ شاید اسلئے کہ ہم اسے آدابِ بندگی نہیں سکھاتے۔ یا اسلئے کہ ہم اسے قوانینِ خداوندی کے دستے سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت اسے اپنی انا کی تسکین کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور

یہی وہ خطرناک خلاء ہے جسے کبھی دینیات لازمی قرار دے کر پُر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی اسلامیات کے پیریڈ بڑھا کر ۔ حالانکہ اُس تعلیم کی "وقعت" اُتنے ہتھوڑا نگوری" سے زیادہ کچھ نہیں جس میں سائنسی اور فنی مہارات کے ساتھ ساتھ پوری کی پوری زندگی قوانینِ خداوندی کے عین مطابق بسر کرنے کا ذوقِ جنون شامل نہ ہو۔ اور یہی وہ طرزِ تعلیم ہے جس کی ایک جھلک طلوعِ اسلام کالج کے خدوخال میں نظر آ رہی ہے۔

لیکن اندیشہ ہے کہ ہماری روایتی بے حسی کا سنگِ گراں یہاں بھی حائل نہ ہو جائے۔ اور اگر بدقسمتی سے ایسا ہو گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہماری مدد نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اس بے حسی کو دُور کرنے والا خود آپ کے سوا کوئی دوسرا ہے نہیں۔ اسلئے میری استدعا ہے کہ اگر آپ مجھے ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جو مجھے غلبہ بکرو بر بھی دے، اور اقبال کی آہِ سحر بھی، تو یاد رکھئیے آپ کو اس سنگِ گراں سے ٹکرانا ہو گا۔ ورنہ جب مستقبل کا مورخ مجھ سے پوچھے گا کہ تم جوئے شیر سے ہمکنار کیوں نہ ہوئے تو میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکوں گا کہ اس قوم میں کوئی کوہ کن ہی پیدا نہ ہوُا۔

محترم خالد سلام

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

محترم صدر صاحب، معزز خواتین و حضرات!

آج کا موضوع ہم سے کہہ رہا ہے کہ جوانی کے پیمانے دن اور ماہ و سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ اس معیار سے پرکھئیے تو قوم کے تنومند جوانوں اور پیرانِ کہن سال میں کوئی فرق نہیں ۔ صدیوں کا فکری جمود، مذہبی تقلید اور سیاسی غلامی آخر اپنا رنگ لاتی ہے اور نوجوانانِ ملت بھی اِن مہلک جراثیم سے غیر متاثر نہیں۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

جوئے شیر

ڈاکٹر جوڈ اسکی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"ہمارا نوجوان طبعتہ شاہراہِ زندگی پر، بلا تعینِ مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم

نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے نہ آئینِ حیات۔ نہ اقدار ہیں نہ معیار؟

یعنی ؎　　تیرا یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے
　　فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

صحیح مقصدِ حیات کا تعین کئے بغیر حاصل کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے آپ چاند کی تسخیر کا کارنامہ دیکھئے۔ چاند تک پہنچنے کے راستے میں حائل موانعات کا دُور کرنا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے خوش بخت دور میں یہ بھی ہو گیا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ وہی قوم جس کے چند افراد، انسانیت کا نمائندہ بن کر، چاند پر اُتر گئے وہ قوم انسانیت کی نگاہوں میں، قابلِ تعظیم نہ بن سکی اور اس کے عالمی استعماری کردار کے داغ، چاند کے داغوں سے زیادہ مہیب، گہرے اور گھناؤنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ایک لفظ کے تغیر کے ساتھ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے "کردار" کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

شاہراہِ حیات پر یوں بے مقصد بگٹٹ چلاتے چلے جانے کی سزا تکان ہے اور تکان کو مستقلاً اپنا لینے کا انجام موت۔ اس سے واضح ہوا کہ انسانی زندگی کا جوئے شیر سے عبارت ہونا کس قدر اہمیت کا حامل ہے!

قرآن مجید نے جو جوئے شیر ہمارے لئے متعین کی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر مقصدِ حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ جس فرد کی ذات نشوونما پا جائے اور اس طرح وہ زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے، وہ آگے بڑھتا جائے گا۔ جس میں اس کی صلاحیت باز نہیں ہوگی، وہ رُک جائے گا۔

انسانی ذات کی (DEVELOPMENT) کے لئے چاہیئے یہ کہ مسخر شدہ کائناتی قوتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جائے، ایسا کرنے سے انسانی ذات میں نکھار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ جوئے شیر واضح ہے لیکن یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے سامنے اوّلاً یہ ملائکہ سجدہ ریز ہو چکے ہوں اور دوم وہ خود بھی اصلاح یافتہ ہو۔ یہ دونوں باتیں ہم میں مفقود ہیں اس لئے اوروں کے متعلق فطرت کا فیصلہ سن کر خوش ہو جانے سے پہلے ذرا ہم سنیں کہ کیا قرآن ہم سے بھی وہی کچھ نہیں کہہ رہا جو اس نے اہلِ کتاب کے مذہبی پروہتوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ اس نے اُن سے کہا تھا:

تبیشیر　أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ (۲/۴۴)

تمہاری حالت یہ ہے کہ لوگوں کو تو بھلائی کی تلقین کرتے ہو لیکن خود وہ کچھ نہیں کرتے جو دوسروں سے کہتے ہو حالانکہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم کتاب خداوندی کا اتباع کرتے ہو۔ تم اگر ذرا عقل و بصیرت سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اتباع کتاب کا پہلا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ خود تمہاری اپنی اصلاح ہو لیکن تم دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو اور اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہیں کرتے۔

لیکن اپنی اصلاح تو بڑی بردباری چاہتی ہے اور مستقل مزاجی۔ ایک مسلسل جدوجہد اور رنگ و تاز۔ جاپان میں ایک فن ہے جس میں دشمن پر قابو پانے کے لئے صرف ہاتھ کو تیشہ کے طور پر استعمال کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ہتھیلی کو کئی سال تک مسلسل سخت چیزوں پر مار مار کر اتنا مضبوط اور تیز کر لیا جاتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک تیشہ کا کام دے اور جب دشمن پر استعمال ہو تو جان لیوا ثابت ہو۔ اس فن کو KARATE کہتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر صرف ہتھیلی کو تیشہ بنا لینے سے اتنا کچھ ہو سکتا ہے تو KARATE کے فن کو اگر تمام انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) پر محیط کر دیا جائے تو کیا نتیجہ برآمد ہو؟ احتسابِ خویش اور اپنے آپ کے ساتھ ٹکرانے سے یہ عمل وجود پذیر ہوگا۔

لیکن یہ کام اکیلے نہیں ہوگا کیونکہ انسانی ذات کہیں اکیلے میں نشوونما نہیں پا سکتی۔ اس کے لئے جو قوانین مقرر ہیں ان میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ یہ کچھ ایک نظام کے تابع ہوگا۔ اس نظام کے قیام کے لئے اوروں کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔

یہ PROCESS "عمل تزمیل" کہلاتا ہے، یعنی اس قسم کے رفقائے سفر پیدا کرنا جو فکری طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ کام نہایت شدت اور انہماک سے مصروفیت چاہتا ہے۔ اس کے لئے بڑی ہمت اور حوصلہ چاہیے۔ اوروں کو اپنی طرف بلانے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ ہمارا اپنا حسنِ اخلاق و کردار ہوگا۔ ایسا کردار جس سے یہ ثبوت ملے کہ واقعی اس پہاڑ کو راستے سے ہٹانے سے ہم سب کی مشترکہ بہبود مراد ہے۔ اس آدمی کا اپنا کوئی فائدہ اس میں شامل نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم کو 'پرندے سدھانے' کی مثال سے یہی بات سمجھانی مقصود تھی۔

آپ دیکھیں گے کہ سیاسی جماعتوں میں بڑی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ اسلئے کہ ان کی نظر صرف ارکان کی تعداد پر ہوتی ہے لیکن یہاں تو بتدریج ایک ایک دو دو کر کے رفقائے سفر میسر آئینگے۔ لیکن جو آتے ہیں

ان کی ایک ایک جست سے صدیوں کی مسافت پل جھپکنے میں طے ہو جایا کرتی ہے۔ بدر و حنین کے معرکے اس کے عملی گواہ ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس راہ میں سستانا بھی نہیں ملے گا۔ اُحد کی پہاڑیاں ہمیں یہ سبق بھی دے رہی ہیں کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

جیسا کہ پرویز صاحب ہمیں بتاتے رہتے ہیں، کثرتِ تعداد سے زیادہ کارآمد اخلاص ہے جس کا معیار ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہم قدم قدم پر اس کا جائزہ لیں کہ میرے اپنے اندر کس قدر "تبدیلی" پیدا ہوئی ہے اور میری رفاقت سے اس جوئے شیر کے لانے میں کس حد تک مدد ملے گی۔

"ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ کسی کے پاس کیا ہے بلکہ یہ کہ وہ خود کیا ہے۔"

یہی بنیادی "تیشہ" ہے اور تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس فکر کو اپنانے سے اپنے اندر کس قدر "تبدیلی" ہوئی ہے عزت و فضیلت ماپنے کا معیار یہ تبدیلی ہونا چاہیئے نہ کہ خارجی مقبوضات۔

اس تبدیلی کے لئے ہم انفرادی طور پر کیا کچھ کر سکتے ہیں؟ باہمی معاملات میں عدل و احسان، حسنِ تعاون، احترامِ انسانیت، قول کے پکے، بات کے سچے، حسد، کینہ، تنگ نظری، منافقت سے سینوں کو پاک رکھیں۔

سنگِ گراں یہ ٹھیک ہے کہ نظامِ ربوبیت کی راہ میں سرمایہ دارجماعتیں اور فی سبیل اللہ فساد برپا کرنے والا مذہبی پیشوائیت کا طبقہ سنگِ گراں بن کر کھڑے ہیں اور انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ خدا کے قانونِ مکافات کا تیشہ اس قدر قوتوں کا مالک ہے کہ یہ انہیں پرکاہ کی طرح راستے سے ہٹا کر الگ کر دیگا۔ لیکن یہ کچھ ہوگا ایک ایسے انقلاب کے نتیجے میں جس میں

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۸۳/۶)

نوعِ انسانی ربوبیت عالمین کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

لیکن ایسا ہونا کیوں نہیں؟ ایسا ہو کیوں نہیں چکتا تاکہ انسانیت سکھ کا سانس لے! اسلئے کہ یہ چیزیں از خود نہیں ہو جایا کرتیں۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی ان آہنی دیواروں کو ڈھانے کے لئے تیشہ بردار کی ضرورت ہے۔ ایسے تیشہ بردار کی جو "بخود خزیدہ و محکم" ہو۔ اسے اقبال کی اصطلاح میں عشق کہتے ہیں۔ اگر عشق نہ ہو تو یہ تیشہ بردار خارجی موانعات دیکھتے ہی ہمت ہار، تیشہ پھینک، راہ میں کھپڑی ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور قومِ بنی اسرائیل کی طرح پکار اٹھتا ہے کہ "اے موسیٰ! تو اور تیرا خدا جا کر مستبد قوتوں سے لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" نتیجہ یہ کہ ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ خود آگے نہیں بڑھتے بلکہ پیچھے

آنے والوں کے راستے میں بھی روڑہ بن جاتے ہیں

اس سے واضح ہے کہ زندگی نام ہے اپنے مقصدِ حیات کی طرف رواں دواں چلتے رہنے کا اور اگر راہ میں کوئی موانعات آئیں تو انہیں کامیابی سے ہٹا کر آگے بڑھتے جانے کا ۔۔۔ اگر کوئی سنگِ گراں ناقابلِ تسخیر سمجھ لیا جائے تو کیا ہوتا ہے؟ انسان پر مردنی چھا جاتی ہے اور زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ناکامیوں سے جس قسم کی اذیت پہنچ سکتی ہے اس کا اندازہ امتحان میں فیل ہو جانے والا حساس طالب علم خوب لگا سکتا ہے کہ یہ احساسِ محرومی دراصل کہیں خارج سے عاید نہیں ہوتا، یہ انسان کی اپنی داخلی کمزوری، کم ہمتی اور کام نہ کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔ ان ترقی کے رُک جانے سے یہ اضطراب انگیز کیفیت بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ آگ دلوں کو لپیٹ لیتی ہے اور کشاکشِ حیات سے دست و گریباں ہونے کے بجائے انسان بہانہ تراش بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سہل انگاری اور عافیت کوشی کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبالؒ خون کے آنسو روتے تھے اور کہتے تھے کہ

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

جونہی تن آسانی آئی، مذہبی پیشوائیت نے اپنے لشکروں کو پکار کر کہا کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

دیکھا آپ نے "مذہب" آپ کو کہاں سے روک رہا ہے؟ ۔۔۔ عالمِ کردار سے ۔۔۔ یہ حالت بڑی تشویش انگیز نظر آتی ہے لیکن جیسا کہ آپ سمجھ چکے ہوں گے یہی تو وہ سنگِ گراں ہیں جنہیں ہم نے راہ سے ہٹانا ہے ۔۔۔ تن آسانی اور کردار سے بیزاری ۔۔۔ اپنے کو پھر سے عالمِ کردار میں لانا ہوگا۔

آپ نے غور کیا کہ یہی ذات جب غلط معاشروں کی پروردہ ہو تو اس کی LOP - SIDED DEVELOPMENT بجائے خویش قدم قدم پر رکاوٹ کا موجب ہوتی ہے۔ لیکن جب اسے اپنے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر تیز اور سخت کوش کر لیا جائے تو یہی تیشہ ثابت ہوتی ہے۔ خارجی موانعات کے مقابل میں۔ ایسا تیشہ کہ پھر موت جیسا سنگِ گراں بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔

خودنگری یا احتسابِ خویش

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ انسانی صلاحیتوں کا خود نگر ہونا نہایت ضروری ہے۔ جوانی میں انسان سنبھلا نہیں بیٹھ سکتا فطرت جسم میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ جسمانی نشو و نما پورے طور پر ہو سکے۔ یہ برق رفتاری

تحیرانگیز انقلابی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ ان صلاحیتوں کا صحیح رُخ پر چلنا اور ساحلوں کے حصار میں رہنا نہایت ضروری ہے ۔ اگر دریا کا پانی ساحلوں میں مقید نہ ہو تو اسے دریا نہیں سیلاب کہا جاتا ہے ۔ یہ سیلاب کیا کرتا ہے اس کا اندازہ ہمارے پچھلے اور موجودہ دور کے ہنگاموں اور تحریکوں کے مطالعہ سے بخوبی لگ سکتا ہے جن کے نتائج بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہ نکل سکے۔ اسی لئے ہمارے مفکرِ قرآن نے اپنے رفقائے سفر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ۔ "انسان کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام "احتسابِ خویش" ہے۔ آپ کی تحریک محض ایک تنظیم کا نام نہیں۔ یہ دل و نگاہ کی تبدیلی کی تحریک ہے۔ یہ صرف قرآنی تصورات کو ذہنی طور پر سمجھ لینے کی تحریک نہیں۔ یہ ان تصورات کے مطابق اپنے اندر انقلاب پیدا کرنے کی تحریک ہے۔ اگر آپ کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوتا تو پھر آپ کی اس تحریک سے وابستگی نہ صرف بے مقصد ہے بلکہ خود فریبی کا موجب بھی ہے"۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتنا صبر آزما مرحلہ ہے۔ ہر قدم پر آدمی اپنے ہاتھوں شکست کھانے لگتا ہے۔ "عمل تزمیل" سے پہلے اور اس کے ساتھ ساتھ جب تک "احتسابِ خویش" کا عمل جاری نہ رکھا جائے اور اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کر لی جائے یہ واقعی خود فریبی رہے گی۔ یہ بڑا مشکل۔ لیکن سہل ہو یا دشوار ۔ راستہ بہر حال یہی ہے کیونکہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

عزیزہ خالدہ ملک

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے!

آج کے خطاب کا عنوان ہے 'زندگی'۔ زندگی کی تعبیر ہے جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں۔ یہ تعبیر ایک نظریۂ حیات بھی ہے، ایک لائحہ عمل بھی اور زندگی کی تعبیر بھی۔

زندگی کا مقصود ہے جوئے شیر لانا۔ یہ مقصد حاصل ہوتا ہے تیشہ سے۔ تیشہ کی ضرورت اسلئے ہے کہ زندگی کا زمانی اور مکانی راستہ سنگلاخ ہے۔ جوئے شیر، تیشہ اور سنگِ گراں علامتیں ہیں۔ جوئے شیر مقصد کی علامت ہے۔ مقصد وہ منتہا ہے جس کی طرف زندگی ارتقا کر رہی ہے۔ زندگی نے طویل سفر طے کیا ہے اور طویل تر سفر اُسے درپیش ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں!

اس طولانی سفر میں زندگی مخالف قوتوں کو مغلوب کرتی آگے بڑھتی ہے۔ اس جہاد کی علامت تیشہ ہے۔ مخالف قوتیں جن سے تصادم اور تزاحم ہوتا ہے، سنگِ گراں ہے۔ زندگی کا مظہرِ اعلیٰ انسان ہے، وہ جوئے شیر کے لئے تیشہ سے سنگِ گراں کو کاٹتا ہے۔ یوں اس کے لئے زندگی جہد ہے استغناق نہیں۔ زندگی کو ماپنا ہو تو اس کی قوتِ تسخیر سے ماپئے۔

زندگی کی ہر عہد اور ہر مقام پر تعبیریں ہوئی ہیں لیکن زندگی کی صحیح تعبیر وحیِ الٰہی کے بغیر معلوم نہ ہو سکی۔

انسانوں میں سے کسی نے مشاہدہ کیا کہ انسان سمیت کائنات ایک مشین ہے جو علت اور معلول کے دھکے سے چلتی ہے۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔ اس کے پیچھے کوئی مقصد نہیں اور اس کا کوئی ناظم نہیں۔

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

کسی نے پکارا زندگی کی اصل قدیم زمانے کی دلدل ہے اور اس کی بلند ترین شاخ بقائے اصلح کی میکانکی پیداوار۔ کسی نے اعلان کیا کہ انسانی اعمال وراثت اور ماحول کا ملغوبہ ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل کو ملتے ہیں۔ کسی نے دعویٰ کیا کہ انسانی اعمال کا سرچشمہ مولّید ہیں۔ یہ مولّید انسانی شکل و صورت اور انسانی اعمال و تصورات کے خالق ہیں۔ کسی نے دیکھا انسان کی باگ ڈور لاشعوری جذبات کے ہاتھ ہے۔ کسی نے انکشاف کیا کہ اصل انسان معاش ہے اور معاشی تعلقات انسانی نظریات کے خالق ہیں۔ گویا انسان میکانکی قوتوں کے ہاتھ بے بس کھلونا ہے۔

دوسری طرف کوئی مادہ کے فریب اور مصائب سے بھاگا اور ایک گوشہ میں جا دبکا۔ ایک مرگ آمیز سکوت میں مادہ سے جان چھڑانا زندگی کو قوت اور حسن سے محروم کر بیٹھا۔

ایوانِ علم و سائنس سے اب اس ستم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ زندگی نہ مادہ ہے نہ ترکِ مادہ، بلکہ

تغیر مادہ ہے۔ زندگی بم کے گولے کی طرح پھٹتی ہے۔ زندگی کی قوت بم کا بارود ہے۔ مادہ کی رکاوٹ بم کا فولادی خول۔ ایک پھیلنے والی اور دوسری روکنے والی۔ ان دو قوتوں سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔

بتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

مادہ کی اصل غیر مادی ہے۔ مادہ کی اصل برقیات ہیں۔ جیسے برقی لہریں محصور ہوں تو مادہ، آزاد ہوں تو روشنی۔ یہ توانائی ہے یا حرکتِ محض۔ کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے ایک شے ہے ہی نہیں۔ کائنات شے نہیں عمل ہے یا حوادث کی مربوط عمارت۔ اس عمارت کے تعمیر کرنے والے قوانین فطرت ہیں۔ ان قوانینِ فطرت کی اصل کو میکانکی انداز سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ زندگی میکانکی قوتوں کا نتیجہ نہیں۔ اس کی مادی تعبیر ممکن ہی نہیں۔ زندگی کی اپنی اصل ہے اور اپنے مقاصد۔ یہ اپنے تخلیقی تحرک سے آگے بڑھتی ہے اور مادہ یا توانائی کو اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مادہ اور زندگی کا مبدا خدا کا عالمِ امر ہے۔ کائنات کا ارتقائی سلسلہ ایک منزل کی طرف جا رہا ہے۔ زندگی کا مقصد کائناتی مقصد کا ایک حصہ ہے۔ خدائی مخلوق میں انسان ہی اس قابل بنایا گیا ہے کہ شعوری طور پر خالق کے تخلیقی پروگرام میں شرکت کر سکے۔ ان تخلیقی کارناموں سے انسان خود خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ اب پہل انسان کے ہاتھ میں ہے — اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ ۔ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ — انسان اگر پہل نہیں کرتا، اگر وہ زندگی کی ممکناتی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا وہ انسان نہیں رہتا۔ خود سنگِ گراں بن جاتا ہے۔ ؎

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جو انسان زندگی کی ممکنات سے آشنا ہے وہ انتظار نہیں کرتا کہ حوادثِ عالم اپنے طریق پر اسکے مقصد کی سمت چلیں۔ وہ زمانے کا انتظار نہیں کرتا کہ ساز گار ہو۔ وہ زمانے کو مجبور کرتا ہے کہ اسکے پروگرام کے مطابق چلے۔ وہ حوادث کی عمارت خود تعمیر کرتا ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی ذات کی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ نوعِ انسان کے مقدرات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

جوئے شیر کائنات کی مستقل اقدار ہیں جو خدائی صفات کا عکس ہیں اور خود زندگی کے اندرونی ولولے ہیں۔

مخالف قوتوں کا ہجوم سنگِ گراں ہے۔ انسان اس تیشہ سے سنگِ گراں کاٹ کر جوئے شیر لا کر رہیگا۔ انسان کی یہ تکمیل خدائی آرزوؤں کی بھی تکمیل ہوگی۔ اس سفر میں خدائی قوتیں ان انسانوں کی حافظ و ناصر ہوں گی۔ ؎

جو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار!
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے!
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے!

عزیزہ کاشمیری چغتائی

کشمکشِ حیات

(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

محترمہ صدرِ مذاکرہ۔ بھائیو اور بہنو!

میں اس بزم میں دوسری مرتبہ شرکت کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ سالِ گذشتہ مذاکرہ کا موضوع تھا۔ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر۔ اس دفعہ کے موضوع کا ملخص یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل کشمکش کا نام ہے جس میں قدم قدم پر موانعات سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ان موانعات کے دور کرنے سے حصولِ مقصد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سالِ گزشتہ اور امسال کے موضوعات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ جب تک راستے کے موانعات پر غالب نہ آیا جائے، نئے صبح و شام پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان موانعات کا دور کرنا ہماری نئی نسل کی عظیم ذمہ داری ہے۔ اسی سے ہماری آج کی افسردہ، مغموم اور تاریک دنیا میں حیاتِ تازہ کی نمود ہو سکتی ہے۔

اقبالؒ نے اپنے اس مصرعہ میں جو ہمارے مذاکرہ کا موضوع ہے، درحقیقت تین فلسفیانہ تصورات کو نہایت جامعیت سے پیش کیا ہے۔ سب سے پہلا تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی متعین نصب العین

ہونا چاہیئے۔ دوسرا یہ کہ اس نصب العین تک یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس کی راہ میں بڑے بڑے سنگِ گراں آئینگے جن کے دور کرنے کے لئے جہادِ مسلسل کی ضرورت ہوگی اور تیسرا یہ کہ ان موانعات کو راستے سے ہٹانے کے لئے اسباب و ذرائع کی ضرورت لاینفک ہے۔

میں سب سے پہلے ان سنگِ گراں کا مختصراً تذکرہ کرنا چاہتی ہوں جو ہمارا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ ان موانعات کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے (اور ہوتی ہے) لیکن روح ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی یہ روح مختلف (ISMS) کی شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ اور یہی (ISMS) درحقیقت انسانیت کے لئے بدترین لعنتیں ہیں ـــ مثلاً نیشنلزم۔ کمیونزم۔ کیپٹل ازم۔ سوشلزم۔ یہ اور ان جیسے اور انسانوں کے خود ساختہ "ازمز" ہیں جو وحدتِ انسانی کے راستے میں سنگِ گراں بنکر حائل ہیں اور انسانوں کی عظیم برادری کو گروہوں اور طبقوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتی ہوں کہ اگر کسی دوسرے کرّے کا کوئی ذی شعور باشندہ فضا کی پہنائیوں سے کرۂ ارض کا نظارہ کرے، تو وہ اس (بزعمِ خویش) "اشرف المخلوقات" کو جن سرگرمیوں میں مصروفِ کار دیکھے گا وہ کس قدر باعثِ ندامت ہوں گی ـــ وہ دیکھے گا کہ اس کرۂ ارض کے نقشے پر لکیریں کھینچ کر انسان کو انسان سے الگ کیا گیا ہے اور پھر ایک خطہ کا انسان دوسرے خطے کے انسان کے سینے پر بندوق تانے کھڑا ہے۔ وہ دیکھے گا کہ انسانی فکر و عمل اور نقل و حرکت پر شدید پابندیاں لگ رہی ہیں محض اس لئے کہ ایک انسان ایک سیاسی حلقہ میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا انسان کسی دوسرے حلقہ میں ـــ روسی، چینی، امریکی، فرانسیسی، جرمن، انگلش وغیرہ تشخصات و امتیازات سب انہی خیالی حلقوں کے پیدا کردہ ہیں اور انسانوں کو بھیڑیا بنا رہے ہیں۔

سیاسی حد بندیوں سے آگے بڑھئے تو مذہبی گروہ بندیاں، اسلاف پرستی، تقلید، جہالت، قدامت پرستی، طبقاتی تفریق وغیرہ وہ آہنی دیواریں ہیں جو عالمگیر انسانیت کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہیں۔ آج ہر اپیل اپنے اپنے گروہ کے مفاد کے تحفظ کے لئے ابھرتی ہے۔ انسانیت کے مفاد کی حفاظت کے لئے کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی اور یہی گروہ بندانہ مفاد پرستیاں ہیں جو ہر دس بیس سال کے بعد ایک عالمگیر جنگ کے روپ میں وجۂ ہلاکتِ انسانیت بنتی رہتی ہیں۔

آج دنیا کے ہر ذی شعور اور حساس انسان ـــ مرد اور عورت ـــ کے سامنے زندگی کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان خود ساختہ حد بندیوں کے موانعات کو راستے سے ہٹائے اور اس طرح ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی طرح ڈالے جس میں اس قسم کی کوئی حد بندی نہ ہو۔ جو بیرونی خلا کو سَر کرنے سے پہلے اس خلا کو سَر کرے جو ایک انسان اور دوسرے انسان کے قلب کے درمیان حائل ہے جس میں تمام افراد

ایک خاندان کی طرح، تمام نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرمِ عمل ہیں جس میں "میری اور تیری" کی تمیز ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا نہ بنائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کے لئے عملی قدم کس طرح اٹھایا جائے؟ اس اہم سوال کا جواب ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم سب، متحدہ طور پر، قرآن مجید کی راہ نمائی میں آگے بڑھیں اور ان موانعات کو دور کرنے کے لئے ذرائع و اسباب پیدا کریں۔ ان میں بنیادی اور سب سے ضروری ذریعہ قرآنی اقدار کے مطابق اپنے کیریکٹر میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگا۔ اسلئے کہ داخلی تبدیلی کے بغیر، خارجی اسباب و ذرائع کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ راستے کے ایک پتھر کو اکھاڑنے کی کوشش میں دو اور پتھر گڑ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل انفرادی کوشش سے ممکن نہیں۔ اس کے لئے ایک جماعت کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ لیکن یہ جماعت صرف ان افراد پر مشتمل ہونی چاہیئے جو اس نصب العین حیات پر دل و دماغ کی کامل ہم آہنگی سے بہ طیب خاطر اس مقصد کے حصول کے لئے تعاون کریں۔ لا اکراہ فی الدین۔ اس پروگرام کا بنیادی نقطہ ہے۔ اس معاشرہ میں کسی ایسے مقصد کے حصول کے لئے جس کی صداقت پر اسے یقین نہ ہو کسی فرد کو جان دینا تو ایک طرف قدم اٹھانے پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمہارے ہاں پناہ لینے کے لئے آئے تو اسے پناہ دو۔ اسے قرآن سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اسے اپنی حفاظت میں اس کے مامن تک پہنچا آؤ۔

میں اپنے خطاب کو ان الفاظ پر ختم کرنا چاہتی ہوں کہ میرے نزدیک زندگی ایک جہدِ مسلسل ایک سعیِ پیہم ایک کشمکشِ دوام کا نام ہے۔ اور اس تمام کشمکش کا مقصد ایک فرد کی اپنی ذات اور دیگر افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ان موانعات کو ہٹایا نہ جائے جو کاروانِ انسانیت کی راہ روکے کھڑے ہیں۔ یہ پروگرام خدا کی کتابِ عظیم میں عطا کردہ راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

والسلام!

محترمہ غلام دستگیر

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

صدر، خواتین و حضرات!

آج ہم جس ماحول میں زندہ ہیں، اس میں ظلم ہے، فساد ہے، معاشرتی برائیاں

ہیں، معاشی بے انصافیاں ہیں، جہالت اور توہم پرستی کا دور دورہ ہے، خیالات کی پستی اور خبثِ باطن کی حکمرانی ہے۔ اظہارِ ذات پر پابندی کی زنجیریں ہیں۔ اور محبت، مروت، دیانت اور ایثار کی روشن قندیلیں مدھم ہی نہیں بلکہ بجھتی چلی جا رہی ہیں — یعنی زندگی ایک ناگہانی بلا بن چکی ہے۔

اس قسم کے مہیب ماحول میں جب ایک انسان آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس سے خوفزدہ ہو کر چور یا ڈاکو بن جاتا ہے یا کسی جنگل میں پناہ گزین ہو کر اپنے تراشیدہ خداؤں کی پوجا پاٹ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ انسانوں کے اس قسم کے رویے اُن کے خارجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن اس ظلم اور جہالت کی فضا میں کچھ انسان، اس تاریکی کو روشنی میں بدلنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے موجودہ ماحول کی از سرِ نو تعمیر کرنے کی جد و جہد کرتے ہیں اور ان کی زندگیوں کا "فردا" — "امروز" سے روشن تر ہوتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اُن عظیم افراد میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کی تاریکیوں کے خلاف اپنی آواز کو بلند کیا۔ تصوف کی تعلیم کے فطری نتیجہ کے طور پر مایوسی کے بڑے بڑے سنگِ گراں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر جمائے ہوئے تھے۔ اقبال نے انہیں پاش پاش کر کے قوتِ فکر و عمل کی اثباتیت کا احساس دلایا اور عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا کر مسلسل جد و جہد پیہم تگ و تاز کو افراد کی زندگیوں کا وطیرہ بنایا۔ اور زندگی کی معنویت سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

حضرات! جب ظلم اور جہالت کی حکمرانی ہو، اُس وقت جمود اور مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب کر دنیا سے کنارہ کشی کر لینے کا مطلب، دراصل، ظلم اور جہالت کی تائید کرنا اور اُس کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ تصوف، جو کاہلانہ قناعت کا دوسرا نام ہے، دراصل ملوکیت کے ظالم اور جہالت آمیز نظام کی پشت پناہی کرتا ہے — اس کے برعکس، چوری اور ڈاکہ زنی کی راہیں بھی دراصل ملوکیت کے نظام کو مضبوط تر بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ چونکہ فساد کے سامنے کوئی عظیم مقصد نہیں ہوتا، اسلئے ظلم کی قوتیں اپنے دفاع کے لئے آسان قسم کا دوسرا گروہ پیدا کر لیتی ہیں اور پھر فساد برپا کرنے والوں کی تگ و تاز، محض ظلم کے محافظوں سے نبرد آزما رہنے تک محدود رہ جاتی ہے اور اس ٹکراؤ سے کوئی واضح اور مفید نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلئے ایک مفسد اور متصوف زدہ کی زندگی سے ایک انقلابی کی زندگی قطعاً مختلف بلکہ اُس کے برعکس ہوتی ہے۔ ایک انقلابی زندگی کا مطالعہ نہایت دیانت سے کرتا ہے اور پھر اُسے تبدیل کرنے کے لئے اپنے دل و دماغ کے اطمینان سے چند راہوں کو تلاش کر لینے کے بعد اُن پر محوِ سفر ہو جاتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے سفر کے دوران

ہر لمحہ اور ہر آن اپنی منزل کی جانب رفتار کو تیز تر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا احتساب بھی کرتا رہتا ہے — اور پھر "شہید" ہو کر دوسروں کے لئے سامانِ حیات فراہم کر جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سرخیٔ خونِ شہیداں سے نئی نسل کا نصابِ حیات ترتیب پایا کرتا ہے۔ شہید کے خون سے قوموں کی عقل و فکر کی قوتیں روشن تر اور رفتارِ کارواں تیز تر ہو جاتی ہے — اور پھر ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے جب زندگی اپنی بنیادوں سے بدل چکی ہوتی ہے اور پھر انسان اُس جنت نظیر فضا کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہی وہ جنت ہے جس کے حصول کے لئے وہ صدیوں مارا مارا پھرتا رہا۔ یہی وہ فردوسِ گم گشتہ ہے جس کی تلاش میں خون کی ندیاں بہائی گئیں — اور یہی فرہاد کی جوئے شیر ہے — !

علامہ اقبالؒ اسی قسم کے فرہاد صفت مسافروں کو جو زندگی کو بدلنے اور اُسے جنت نظیر بنانے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں، زندگی کا حقیقی مفہوم سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اسکی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

حضرات! جیسا کہ میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ ایک انقلابی زندگی کا مطالعہ نہایت ذہانت سے کرتا ہے یعنی اپنی فکر و تدبر کی قوتوں کو عمل میں لا کر زندگی کے اجزا کے مفہوم کا سچا اور حقیقی شعور حاصل کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مرحلہ ہے جو اُس کے مستقبل کی راہوں کی بنیادیں بناتا ہے۔ ہم آج اُسی مرحلے سے گذر رہے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی ایک ناگہانی بلا بن چکی ہے — ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس ناگہانی بلا کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں کے سہارے کیا؟ اور پھر ان بنیادوں کو ختم کر کے ہمارے پاس وہ کون سے محکم اصول ہیں جو ہماری کشاکشِ پیہم کو جوئے شیر میں بدل کر رکھ دیں گے۔

ابہام کا سنگِ گراں

پاکستان میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے پورے زور سے یہ اعلان کر رہا ہے کہ مملکتِ پاکستان اسلامی نظام کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ شاید یہ سچ ہے — (شاید اسلئے کہ بائیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس اعلان پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا)۔ چونکہ پاکستان میں اکثریت اُٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لیتی ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اگر آپ مذہب کے علمبرداروں سے دریافت کریں تو ہر ایک اپنی ریاست میں اپنا الگ الگ تصور پیش کرے گا — ایک انقلابی اسلام کے بارے میں اس اجتماعی ابہام کو زبردست سازش سمجھ کر اسلام

کے ماخذ یعنی قرآن کی بارگاہ سے اسلام کے حقیقی مفہوم کو نہایت متانت و ذہانت سے سمجھنے کی کوشش کرے گا اور باعثِ مسرت ہے یہ حقیقت کہ قرآن کی بارگاہ سے کوئی مایوس نہیں ہوسکتا۔ بہر حال جوئے شیر لانے کے لئے سب سے پہلا اور بنیادی سنگِ گراں یہ ابہام ہے، جسے قرآن کے تیشے سے ہی ہٹایا جا سکتا ہے۔

روایات کا سنگِ گراں

جب قرآن کے تیشے سے، ابہام کے سنگِ گراں کو نیست و نابود کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے تو پھر ابہام کے بتوں کے پجاری اپنی لغت شئے حجازی سے، جن میں علم معقود اور مصنوعی تقدس ہی تقدس ہوتا ہے، لیس ہوکر میدان میں آجاتے ہیں، لیکن اس جنگ میں ان کی پوزیشن مدافعانہ ہوتی ہے، اس لئے کہ علم کی قوت ہر انسان کو متاثر کر دیتی ہے۔ یعنی آج یہ لوگ لاکھ تقدس سے یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ نبیؐ سے مرنے والا شہید ہوتا ہے یا ماتا درا صل ماتا دیوی ہے، کوئی کان نہیں دھرے گا۔ علم کی روشنی اس اندھیرے کو ختم کر کے چھوڑے گی اور قرآن کا طالب علم شہید کے مفہوم و معانی اور مقام و مرتبہ کو اپنی قوتِ ذہانت سے عظیم تر بنا رہیگا۔

ابھی چند روز ہوئے انسان نے تسخیرِ قمر کر کے عظیم الشان فتح حاصل کی ہے۔ اس پر جتنی بھی خوشی ہوا جائے کم ہے، اس لئے کہ اس سے انسان نے کئی نامعلوم اور پوشیدہ رازہائے کائنات سے پردہ اٹھایا ہے، جو بہر حال خوش آئند ہے۔ لیکن مذہب کے اجارہ دار اس پر حیران و پریشان ہیں، کئی ایک نے تو اس حقیقت کو افسانہ قرار دے دیا ہے اس لئے کہ ہر مذہب میں چاند کے بارے میں عقیدوں کی لمبی لمبی داستانیں تراشی ہوئی ہیں۔ اسلام جیسے مذہب بنا دیا گیا ہے، بھی اس سے متاثر ہوا۔ وہ اس طرح کہ یہ وضعی عقیدہ عام ہے، جسے حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ حضورؐ نے اشارہ کیا اور چاند آن کے قدموں کو چوم کر واپس چلا گیا۔ یا بازوؤں کے دونوں حصوں کے نیچے سے گذر کر اپنی جگہ پر جا لگا، یا یہ کہ حضورؐ نے چاند کو اشارہ کیا اور وہ زمین پر نیچے آکر ایک پہاڑی کے دونوں طرف سے ہو کر دوبارہ اپنی جگہ جا لگا۔ میں گئے دنوں کے لوگوں کی بات نہیں کرتا بلکہ یہ وضعی عقیدہ اس دور کے ایک عالم جناب مودودی صاحب کی تفسیرِ قرآن "تفہیم القرآن" میں بھی نظر آئے گا۔

بہر حال آج کائنات کے بارے میں انسانی علم ان باطل عقیدوں سے کہیں بلند ہے، اور دورِ جدید کا انسان اس قسم کی توہم پرستیوں پر مسکرا دینے کے سوا اور کوئی ردعمل نہیں دکھا سکتا۔ لیکن مذہب کے پجاری اس قسم کی دیگر روایات کو جو سراسر علم و مشاہدے کے خلاف ہیں، انہیں اپنا تہذیبی اور آبائی ورثہ کہہ کر ان کے تقدس کو ایک نصاب تعلیم کے طور پر نافذ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا نعرہ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اسلامی ہونا چاہیئے۔

باقی ۸۸ کے پر

طلوعِ اسلام کنونشن

سرسیدؒ کا وارث

محترم چودھری عطاء اللہ صاحب

انسان کہ حیوان ہی کی ایک ترقی پائی ہوئی نوع ہے، دیگر انواعِ حیوان پر اُسے اِس اعتبار سے بھی برتری اور فضیلت حاصل ہے کہ ذاتِ انسانی میں ایک ایسی استعداد اور صلاحیت پنہاں ہے جس سے وہ اشیاء کی ماہیت اور حقیقت کو جان سکتا ہے اور کائنات کی وسعتوں میں بکھری ہوئی اشیاء کی ترکیب و ترتیب سے باخبر ہو کر خارجی کائنات سے متعلق اپنے عمل کی راہیں خود متعین کر سکتا ہے۔ انسان کے اسی جوہرِ پنہاں کو آشکارا کرنے کی سعی و کاوش کا نام ہے "تحصیلِ علم"۔

علم ہی کی معجز نمائی سے تسخیرِ کائنات کے سہانے خواب حقیقت کا رنگ اختیار کرتے ہیں اور علم ہی کی بدولت ذاتِ انسانی کو وہ استحکام اور عروج ملتا ہے کہ ذات، اپنے زورِ دروں سے موت کی پُرہول وادیوں کو اُلانگتی ہوئی حیاتِ ابدی کے چشمۂ شیریں تک رسائی حاصل کر پاتی ہے۔ ؎

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

خود نگری، خود گری و خود گیری شجرِ علم ہی کے ثمرات ہیں اور علم ہی وہ جوئے رواں ہے جس کے آبِ شیریں سے ایمان و عمل کی سدا بہار کھیتیاں لہلہاتی نظر آتی ہیں۔ تاہم جس طرح دنیا میں روشنی اور تاریکی پہلو بہ پہلو موجود ہیں اسی طرح علم کی تابناکیوں اور ضو فشانیوں کے علی الرغم جہالت نے بھی آج تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔

انسان، کہ حیوان ہی کی ایک نوع ہے، جہالت اور حیوانیت کے خول سے نکل آنے کو بآسانی آمادہ و تیار نہیں ہوتا۔ عناصرِ فطرت پر فرماں روائی کی نسبت اُن سے خائف اور مرعوب رہنا ماضی میں اسے زیادہ

پسند رہا ہے۔ علم کی شمع جہاں کہیں بھی روشن ہوئی ہے جہالت کے جھکڑ اور طوفان ہر چہار طرف سے اس پر جھپٹے پڑے ہیں۔ علم کے چراغ جس کسی نے بھی جلائے ہیں، عصارِ جہل کے قلعہ داروں نے طعن و تضحیک کے تیروں کی اس پر بوچھاڑ کر دی ہے۔ تاہم جس طرح باطل تدبیر حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، جہالت کی تاریکی بھی علم کے نور کے سامنے رک نہیں سکتی۔ اُسے راہ فرار ہی اختیار کرنا پڑتی ہے اور بالآخر علم ہی کی فتحمندی کے پھریرے فضا میں لہراتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہماری اپنی تاریخ علم و جہل کی آویزش اور پنجہ آزمائی کی ایک طویل اور المناک داستان ہے۔ مسلمانوں کے عروج و کامرانی کے ادوار عسکری قوت اور سیاسی بالادستی سے کہیں زیادہ ان کے علمی کارناموں سے مزین دکھائی دیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ علم اس قوم کے ذکور و اناث پر فرض ٹھہرایا گیا تھا۔ اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ کسی چیز کو قبول و اختیار نہ کرو جب تک تمہیں اس کی جان پہچان اور اس کا علم حاصل نہ ہو جائے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس قوم نے بھی جس کے ایمان و عمل کی بنیاد ہی علم پر رکھی گئی تھی۔ علم کے نور سے منہ موڑ کر جہالت کی تاریکیوں میں ڈوب جانا گوارا کر لیا۔ کم از کم برعظیم پاک و بھارت میں تو ہم پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب جہالت اور بے علمی کو ہم نے اپنا امتیازی نشان بنا لیا تھا۔ اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے درمیان علم کی مخالفت مذہب (دین) کے نام پر ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کی آڑ میں علم کو ہمارے لئے شجرِ ممنوع قرار دے لیا تھا۔ وہ لوگ اگر اپنے عزائم میں کامیاب ہو جاتے تو پاکستان کے قیام کا تو ذکر ہی کیا برعظیم کے مسلمانوں کا حشر بھی ہسپانیہ کے مسلمانوں کے انجام سے مختلف نہ ہوتا۔ اسلام کے ان نادان دوستوں کے حوصلوں پر تو سرسید علیہ الرحمۃ کی مومنانہ فراست اور بے باک جرأت نے اوس ڈالدی۔ اس مردِ راہ داں کے خلوص اور عزم راسخ نے قوم کو تباہی سے بچا لیا۔ سرسید کی تحریک علیگڑھ نے ہمیں ایک فکری اور جذباتی مرکز مہیا کر دیا اور اس مرکزیت نے ہی ہمارے قومی تشخص کو قائم اور برقرار رکھا اور ہم ہندو اور انگریز کی سیاسی سیاست کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ سرسید یقیناً پاک و بھارت کی ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بانی و امام تھے۔ اور وہی یہاں کی سیاست میں دو قومی نظریہ کے بھی خالق تھے۔ چنانچہ اس بارے میں قائد اعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بالیتھو لکھتے ہیں کہ حصولِ تعلیم کے لئے سمندر پار انگلستان کا سفر اختیار کرنے کی بجائے محمد علی جناح ۱۸۹۲ء میں اگر علیگڑھ کا رُخ کرتے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ناگزیر علیحدگی کی اہمیت ان پر کہیں پہلے واضح ہو جاتی۔

سرسید سے بڑا ماہر تعلیم برعظیم نے پیدا نہیں کیا۔ لیکن ایک ماہر تعلیم سے بڑھ کر سرسید دینی فکر کے جمود کو توڑنے اور اجتہاد کی راہیں کھولنے والے ایک عظیم راہنما تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے دینی فکر کو

تعلیمی تحریک سے علیحدہ الگ رکھا۔ سرسید کے تعلیمی نظریات کو تو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ان کے ہموطنوں نے قبول کر لیا، لیکن دین کی راہ سے ہٹی ہوئی مذہبی پیشوائیت نے اسرائیلیات کے افسانے اور دیومالائی رنگ کے تصورات جو صدیوں سے اذہان میں بٹھائے ہوئے تھے، ان سے عوام کو رہائی دلانا بڑا ہی کٹھن اور جاں جوکھوں کا کام تھا۔ سرسید نے اس دشوار مہم کو سر کرنے کا بیڑا بھی اٹھا تو لیا لیکن اس اندیشے سے کہ عاقبت نااندیش قوم ضد میں آکر کہیں تعلیم ہی سے دستکش نہ ہو جائے۔ دین سے متعلق اپنے افکار کو علیگڈھ کالج اور یونیورسٹی کے تعلیمی منصوبے سے الگ رکھا اور جو کچھ اس وقت ہمارے ہاں دین اور مذہب کے نام سے رائج تھا، سینے پر پتھر رکھ کر مدرسۃ العلوم میں اسی کی تعلیم کو گوارا کر لیا۔ تاہم علیگڈھ کا ماحول سرسید کے دینی افکار کا اثر قبول کرنے سے بچ نہ سکا۔ وہاں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کی غالب اکثریت پر فکر سرسید کی چھاپ نمایاں دکھائی دیتی رہی ہے۔

سرسید کی ساعی جمیلہ اس امر پر مرکوز ہیں کہ مسلمان نوجوان علوم جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ اپنے ملی تشخص کو بہر طور قائم اور برقرار رکھیں۔ اس میں کچھ بھی تو کلام نہیں کہ ہمارا ملی تشخص اسلام سے ہماری پیوستگی ہی سے قائم رہ سکتا ہے چنانچہ سرسید نے اپنی ایک تقریر کے دوران مدرسۃ العلوم کے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے بھی ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے اگر تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گئے جیسی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔"

اگرچہ سرسید مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی دعوت بڑی شد و مد سے دے رہے تھے، تاہم اس تعلیم سے مذہبی اعتقادات پر جو زد پڑنے والی تھی اس سے وہ بے خبر نہ تھے۔ لیکن انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اس تعلیم سے خالص اسلام کو وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا جدید علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک سمجھتے ہیں اور اس لئے مسلمانوں میں ان کا پھیلنا نہیں چاہتے وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ ساتھ ہی ان کا یہ قول بھی تھا کہ جس مجموعہ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔ مگر جو دین قرآن کے اوراق

میں محفوظ ہے۔ اسے ان علوم سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن بقول سر سید محض یہ کہہ دینے سے کہ جدید فلسفہ اور جدید علمِ طبیعی سے ٹھیٹھ اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے، خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔ اس مضمون کو سر سید نے اپنی ایک تقریر میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ تقریر کا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

"اس زمانے میں ہمیں ایک جدید علمِ کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھہرائیں، یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔ اس وقت جو بزرگ اس جلسے میں موجود ہیں، میں ان سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علمِ طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا اُن کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار اور یقیناً گنہگار ہونگے۔

"میں ایک شخص ہوں جس کا یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علمِ طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور ان تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانے میں اسلامی مسائل کہلاتے ہوں، یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے، اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ رُوگردانی ہوتی چلی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے، بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرے پر لگ گئی ہیں یا دانستہ لگا دی گئی ہیں۔

"میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرے سے ان غلطیوں کو چھڑانے کا دعویٰ کروں یا حمایتِ اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس اور باعلم لوگوں کا ہے۔ مگر جب میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت ابھی ابھی میں نے بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے، صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے نورانی چہرے کو لوگوں کو دکھاؤں۔ میرا کانشنس (CONSCIENCE) مجھ سے کہتا ہے کہ اگر میں ایسا

نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔

"اے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اس کے جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں۔ اور کچھ چارہ نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔"

سرسید نے اسلام کی صداقت کا معیار یہ پیش کیا ہے کہ قانونِ فطرت اور ایک سچے مذہب میں تضاد نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ قانونِ فطرت خدا کا فعل اور اس کا بھیجا ہوا دین اُس کا قول ہے۔ اِن دونوں میں مطابقت ضروری ہے۔ اسلام کی ترجمانی اور وکالت کرتے ہوئے سرسید نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعے میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان وحی خداوندی سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبیٔ آخر الزماںؐ کے القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو باتیں فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہوں اُس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔

سرسید نے علومِ جدیدہ کے مقابل اسلام کی مدافعت میں اور دیگر ادیان پر اسلام کی برتری ثابت کرنے میں جو کچھ کیا وہ آج کی گفتگو کا موضوع نہیں۔ جو کچھ سرسید اور اُن کی تحریکِ علیگڑھ کے متعلق عرض کیا گیا ہے مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ علومِ جدیدہ کی تعلیم جس سے کسی صورت بھی مفر نہیں ہمارے حق میں اسی صورت مفید ہو سکتی ہے کہ اس تعلیم سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جائے۔

تعلیم کا مسئلہ آج بھی ہمارے لئے سرسید کے دور سے کم اہم نہیں ہے۔ تعلیم مغرب کے جن مضر اثرات کا سرسید کو اس شدت سے احساس تھا وہ اثرات آج کے تعلیم یافتہ اشخاص میں اور بھی زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ دہریت ایک منظم اور جارح تحریک کی صورت میں ابھر کر سامنے آ چکی ہے۔ تعلیمی اداروں کو اس تحریک نے خاص طور پر اپنی زد پر رکھ لیا ہے۔ دین سے بے خبر نوجوان اس کا ایک آسان شکار ہیں۔ تعلیم میں کسی بلند مقصد کے فقدان نے اذہان میں فکری انارکی اور فوضیت کی حالت پیدا کر رکھی ہے۔ طلباء اور ان کے مربیوں کے نزدیک تعلیم سے مقصود فقط معاشی استحصال کی ہنرمندی پیدا کرنا ہے۔ تعلیمی اداروں میں زیرِ تربیت نوجوانوں کو روحِ اسلام سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ تک بھی تو نہیں جانتے کہ قیامِ پاکستان کی اساس کیا تھی۔ اور ہندو سے ہم نے علیحدگی کیوں اختیار کی تھی۔

ہمارے نظامِ تعلیم کی خامیاں اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور اگرچہ ہمارے ہاں ماہرینِ تعلیم کی

بھی کمی نہیں ..... لیکن اس کے باوجود اپنے تعلیمی نظریات کو پاکستان کی فکری اساس سے ہم آہنگ کرنے کی ہم نے سنجیدگی سے کبھی کوشش نہیں کی۔

تو کیا ہمیں پھر کسی سرسید کی ضرورت ہے؟ ہاں تعلیمی اور فکری توضیحات کے اس دور میں ہمیں یقیناً ایک سرسید کی ضرورت ہے جو تعلیم کے بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سے حرم کی راہ دکھا سکے۔ لیکن اس سرسید کو ڈھونڈنے کو جائیں کہاں؟ کہیں بھی تو نہیں، کہ سرسید تو پہلے ہی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز ہی تو اس دور کے سرسید ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مفکرِ قرآن اور ان کے احباب ہمارے بچوں کی تعلیم کے مسئلہ کو ہاتھ میں لے چکے ہیں۔ ایک کالج کے قیام کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے اور بعض ابتدائی مراحل بھی طے ہو چکے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ طلوع اسلام کے زیرِ اہتمام اور مفکرِ قرآن کی زیرِ نگرانی قائم ہونے والا ادارہ سرسید اعظم کے اس حسین خواب کی تعبیر ہوگا جس میں سرسید نے ملت کے نونہالوں کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ، بائیں ہاتھ میں علومِ طبیعی اور سر پر "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کا تاج دیکھا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ وابستگانِ طلوع اسلام صاحبانِ ثروت وحشم میں سے نہیں ہیں۔ ان کی اکثریت معاشرے کے اُس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جس کے افراد کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاں سیم وزر کی فراوانی نہیں، نہ سہی۔ ایمان کی دولت فراواں تو ہے۔ درہم ودینار کی کمی اُن کی حوصلہ مندی کو شکست نہ دے سکے گی۔ کالج قائم ہوگا اور ضرور قائم ہوگا۔ طلوع اسلام کا کالج، اقبالؔ کے شاہیں بچوں کی تربیت گاہ جہاں اُنہیں صحبتِ زاغ کی خرابی کا ڈر نہ ہوگا۔ جہاں سے ہمارے مقدر کے یہ ستارے مہر و ماہ بن کر نکلیں گے۔

جس دستوری انقلاب کا ذکر و بیان ہم برسوں سے لبِ پرویز سے سنتے آئے ہیں، فضا کی سرگوشیاں بتا رہی ہیں کہ اُس انقلابِ عظیم کے برپا ہونے کی ساعتیں قریب آ رہی ہیں کہ اب تو چمنستانِ وطن میں زاغ و زغن بھی بلبلِ ہزار داستاں کے ہمصفیر و ہمنوا ہو رہے ہیں۔ لیکن دل سے نکلی ہوئی بات، اور حالات کے دباؤ کے تحت اُگلی ہوئی بات کا فرق پھر بھی موجود ہے۔ دل کی دنیا خارجی دباؤ سے نہیں تربیتِ قلب و نگاہ سے بدلا کرتی ہے۔ تربیتِ قلب و نگاہ جس کا دوسرا نام ہے انسان سازی، قیامِ مدرسہ سے آپ کو اپنے کندھوں پر یہی بارِ گراں اٹھانا ہے۔

جس نظریۂ تعلیم کی تائید میں آپ کھڑے ہوئے ہیں، کلامِ اقبالؔ میں اس کی حمایت بہت

تکرار سے ہوتی ہے ۔ لہٰذا میں بھی اپنی بات کو اُسی دانائے راز کے اِن دو اشعار پر ختم کرتا ہوں :۔

کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں !
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں !

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے مُلّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے ۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں ۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ کتاب کے تین حصے ہیں ۔ قیمت :۔ حصہ اول آٹھ روپے ۔ حصہ دوم ، سوم ۔ چھ چھ روپے ۔

نظامِ ربوبیت نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا ۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے ۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے ؟ ضرور ہے ۔ اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی ۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے ۔ قیمت چار روپے ۔

خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے ۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے ۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے ۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں ۔ قیمت :۔ قسم اعلیٰ مجلد ۔ نو روپے ۔ قسم دوم ۔ پانچ روپے ۔

اسبابِ زوالِ اُمت مُلّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں ۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے ۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں ۔ صحیح بات کیا ہے ۔ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

پاکستان کا معمارِ اوّل ہماری نئی نسل سرسید کے عظمتِ مقام سے ناواقف ہے ۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے ۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بڑی مفید ہے ۔ قیمت ۔/۳ روپے

ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کالج

(بسلسلہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۶۹ء)

فہرست (الف)

ان حضرات کے اسمائے گرامی جن میں سے ہر ایک نے زمین خریدنے کے لئے مبلغ ۲۵۰۰/- روپے کا گراں قدر عطیہ وسط نومبر سے وسط دسمبر تک عنایت فرمایا، حسب ذیل ہیں:۔

(۱) محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب[له]۔ لاہور (۲) محترم ظہور احمد ملک صاحب۔ راولپنڈی۔

(۳) محترم یوسف علی ضیاء صاحب۔ پشاور (۴) ملک محمد شریف صاحب۔ لاہور

له نوٹ:۔ سہواً اس عطیہ کا اندراج ماہ دسمبر کے شمارہ میں نہ ہو سکا۔ ہم اس فروگزاشت کے لئے ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

فہرست (ب)

وسط نومبر سے وسط دسمبر تک کے تعمیر فنڈ میں عطیات عنایت کرنے والوں کے اسمائے گرامی معہ رقم حسب ذیل ہیں۔

(۱) محترم ڈی۔ وائی شیخ صاحب۔ ایئرپورٹ کراچی۔ ۱۰۰۰/- روپے (۲) بزمِ طلوعِ اسلام مردان۔ ۱۰۰۰/- روپے

(۳) محترم محمد عبداللہ و خواجہ سمیع الحق صاحب۔ اسمٰعیل کوٹ نوشہرہ۔ ۱۰۰/- روپے (۴) محترم ڈاکٹر نور محمد خان صاحب۔ میانوالی۔ ۴۰۰/- روپے

(۵) میجر محمد یوسف ڈار صاحب۔ لاہور چھاؤنی۔ ۱۰۰/- روپے (۶) محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور ۱۵/- روپے

(۷) محترم محمد شریف میر صاحب۔ لاہور ۱۵/- روپے (۸) بزمِ طلوعِ اسلام کراچی (از فروخت چارٹ) ۵۰/- روپے

(۹) محترم بلند اقبال خان صاحب۔ لاہور ۵/- روپے (۱۰) محترم افضل عابد صاحب۔ لاہور ۹/- روپے

(۱۱) محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب۔ جلالپور جٹاں۔ ۲۰۰/- روپے (۱۲) محترم احمد خان بشیانہ صاحب۔ کراچی ۵۰۰/- روپے

(۱۳) محترم حاجی عبدالرشید صاحب۔ میانوالی۔ ۱۰۰/- روپے (۱۴) محترم محمد رمضان خان صاحب۔ پارہ۔ گوجرانوالہ۔ ۱۰۰/- روپے

(۱۵) محترم ماسٹر عبدالرشید صاحب۔ میرپور خاص ۱۰/- روپے (۱۶) محترم حافظ عبدالمجید صاحب۔ پنڈدادن خان۔ ۵۰/- روپے

تصحیح: نمبر شمار ۷۹ صفحہ ۵۲ شمارہ دسمبر کے سامنے مبلغ ۵۰۰/- روپے کی بجائے مبلغ ۱۰۰۰/- روپے ہونا چاہیے تھا۔ تصحیح فرمالیں۔

سیکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

ابوالحسن نغمی

اِسے کیا کہیئے

بابا جی نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ میں طلوعِ اسلام کے لئے ہلکے پھلکے شگفتہ شگفتہ سے مضامین (LIGHT ESSAYS) لکھا کروں جن کا انداز افسانوی (FICTION) ہو لیکن جنہیں پڑھ کر واضح طور پر اندازہ ہو کہ اس میں قرآنی فکر اور بصیرت کارفرما ہے۔ ایک شعر بہ تصرفِ خفیف سنیئے:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن میں اس خیال سے غافل نہیں رہا (فانیؔ)

چند روز ہوئے موسم سرما کی دھوپ میں یوم تعطیل منا رہا تھا۔ مکمل فرصت تھی۔ ماضی کے بہت سے واقعات یاد آئے، یوں کہنا چاہیئے کہ میرے اپنے نہاں خانۂ دل کا ٹیلی ویژن شاہراہ سرکٹ پر فلم دکھانے لگا۔

مجھے ۱۹۵۰ء کے وہ دن یاد آئے جب میں ہجرت کر کے کراچی پہنچا تھا۔ تن تنہا تھا۔ اُس وقت میری عمر اُنیس سال تھی۔ کراچی میں، میں اپنے ایک ثروت مند رشتہ دار کے ہاں مقیم ہوا۔ یہ صاحب ایک بہت اونچے عہدے پر فائز تھے اور خاندان میں ان کے "عشقِ رسولؐ" کے بڑے چرچے تھے۔ کہا یہ جاتا تھا کہ کوئی شخص اگر گفتگو کے دوران میں حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اسمِ گرامی لے لے تو یہ صاحب محض حضورؐ کا نام ہی سن کر آب دیدہ ہو جاتے تھے اور ذکرِ حبیبؐ سن کر زار زار رویا کرتے تھے۔ یہ صاحب جس کاروبار ملازمت سے وابستہ تھے اُس کی اساس سود کے لین دین پر تھی۔ خیر اب اس بات کا کیا اعتراض کیجیے، ملازمت بعض اوقات آدمی کی مکمل ہوئی مجبوری ہوتی ہے۔ اور جب تک کل کا کل نظام نہ بدل جائے کسی کی ملازمت پر اعتراض کرنے والے ہم کون ہیں؟

ہاں تو ان عاشقِ رسولؐ بزرگ کو میں نے بچشمِ خود حضورؐ کے ذکر پر زار زار روتے دیکھا۔ ان کی ہزاروں روپے ماہوار تنخواہ تھی، سود کے کاروبار میں ان کے اپنے حصص تھے۔ جب بھی ان کا جی دنیا کے

بکھیڑوں سے گھبرا کر یہ پرواز کرکے حجاز پہنچ جاتے اور مدینہ طیبہ میں حضورؐ کے روضۂ انور کی جالیوں کے نزدیک کھڑے ہوکر زار زار رویا کرتے۔ بے حد دولت مند تھے۔ پاسپورٹ، ویزا، اور فضائی سفر کی انہیں مکمل سہولت تھی۔ اس لئے امیر مینائی کا یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے ؎

مدینے جاؤں، پھر آؤں، دوبارہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

ان بھائی صاحب کی شکل وصورت یونہی سی تھی لیکن ان کے بارے میں مشہور تھا کہ "دل کے بہت اچھے ہیں"۔ کسی وقت کی نماز قضا نہ کرتے تھے۔ قرآن مجید ترجموں کی مدد سے پڑھتے تھے اور مثنوی مولانا رومؒ انہیں بہت مرغوب تھی۔

میں دو مہینے تک اُن کے ہاں مقیم رہا مگر جتنے دن رہا شرمسار رہا۔ کیونکہ میں نے ایک متوسط الحال خاندان میں پرورش پائی تھی اور بھائی صاحب کا رہن سہن اُن کی ہزاروں روپے ماہوار تنخواہ کے مطابق تھا۔

پاکستان کو قائم ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ کھوکھراپار کا راستہ کھلا تھا۔ مہاجرین اس راستے سے بکثرت کراچی پہنچ رہے تھے۔ ہمارے رشتہ دار بھی کثیر تعداد میں کراچی پہنچ رہے تھے۔ یہ بات اُن تمام رشتہ داروں کے علم میں تھی کہ اُن کا ایک عزیز بے حد دولت مند ہے اور بااختیار حیثیت کا مالک ہے۔ چنانچہ بعض رشتہ دار بھائی صاحب سے ملنے کے لئے گھر آتے۔ ان مہاجر اقرباء کا لباس صاف ستھرا اور مناسب (PROPER) نہ ہوتا۔

ایک روز "کال بیل" کی گھنٹی کی آواز سنکر میں نے دروازہ کھولا تو ہم سب کے ایک نہایت نزدیکی رشتہ دار بوسیدہ لباس میں آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑے تھے۔ میں نے انہیں گلے سے لگایا اور ڈرائنگ روم میں ایک پُرشکوہ صوفے پر بٹھایا۔ بھائی صاحب دفتر گئے ہوئے تھے اس لئے ہمارے یہ مفلوک الحال رشتہ دار کچھ دیر بیٹھ کر شام کو دوبارہ آنے کے لئے کہہ کر چلے گئے۔

بھائی صاحب دفتر سے گھر آئے۔ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بعض گھریلو ملازمین بھی انہی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد گھریلو ملازم نے مجھ سے کہا۔ "صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں"۔ میں اُن کے کمرے میں پہنچا۔ وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مصلے پر تسبیح پھیر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "مجھے آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ ہر ایرے غیرے کو ڈرائنگ روم کے صوفے پر بٹھاتے ہیں"۔ میں سمجھ گیا کہ گھریلو ملازموں نے اپنے صاحب کو مطلع کیا ہوگا۔ لیکن گھریلو ملازموں کو غالباً یہ علم نہ ہوگا کہ وہ مفلوک الحال مہاجر جسے میں نے صاحب کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا، میرا اور ان کا نہایت نزدیکی رشتہ دار تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے

اعتماد سے انہیں بتایا کہ جناب وہ تو میرے اور آپ کے نہایت نزدیکی رشتہ دار تشریف لاتے تھے۔ اس پر وہ بے حد برا مان کر بولے۔ "رشتہ دار خواہ کتنا ہی نزدیکی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ چپڑاسی ہے تو وہ ہمارے صوفے پر ہرگز نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ بات نوٹ کر لیجیے اور آئندہ محتاط رہیے۔" یہ کہہ کر وہ پھر تسبیح پھیرنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے ایک دوست آگئے اور مدینہ طیبہ کی باتیں ہونے لگیں۔ ان کے دوست نے مولانا جامی کا یہ شعر پڑھا۔

بروں آور سر از بردِ یمانی
کہ روئے تست صبحِ زندگانی

اس نعتیہ شعر کو سن کر بھائی صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہچکی بندھ گئی۔ رومال آنسوؤں سے بھیگ گیا اور بڑی دیر تک رقت طاری رہی۔

شام کو وہی مفلوک الحال مہاجر رشتہ دار دوبارہ آگئے۔ اس وقت ہم سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ خانساماں نے اطلاع دی کہ وہی دوپہر والا آدمی پھر آیا ہے۔ بھائی صاحب نے ناراض ہو کر کہا: "اس سے کہو کہ چلا جائے۔ صاحب کے پاس ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے۔"

اب میری کیفیت یہ تھی کہ بظاہر میں کھانا کھا رہا تھا لیکن درحقیقت کھانا مجھے کھا رہا تھا۔ خیر جیسے تیسے جلدی جلدی کھانا کھایا اور گھر سے اس امید پر نکل کھڑا ہوا کہ شاید وہ بے سہارا مہاجر رشتہ دار بس اسٹاپ پر کھڑا مل جائے۔ دیکھا تو وہ کوٹھی کے گیٹ سے لگا حرماں نصیبی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ یہ شخص بھارت کے جس شہر سے ہجرت کر کے آیا تھا، وہاں یہ مسلم لیگ کا نیشنل گارڈ تھا۔ مسلم لیگ کے جلوس میں آگے آگے چلتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان - بٹ کے رہے گا ہندوستان"۔ پھر جب صد فیصد ہندو آبادیوں سے مسلم لیگ کا جلوس نکلتا تو یہ شخص ہندوؤں کو دیکھ کر نعرے لگاتا۔ "رام راج نہیں چلے گا۔ ہندو راج نہیں چلے گا۔ دھوتی راج نہیں چلے گا۔" پھر یہی شخص کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر ایک طویل نعرہ لگاتا۔

"دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے محبوب رہنما قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح —— زندہ باد!"

آج یہ شخص بے کسی اور بے چارگی کی تصویر بنا، بھائی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ سے لگا کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "بھیا اس بھرے شہر میں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ اس کوٹھی میں ملازموں کی کوٹھڑیاں بھی تو ہیں۔ اگر کسی ملازم کی چارپائی کے نیچے فرش پر لیٹنے کی اجازت مل جائے تو یہ بہت بڑا احسان ہوگا۔"

میرا دل بھر آیا۔ اس کوٹھی میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میں رہا کرتا تھا۔ ایک ہی پلنگ تھا۔ میں نے چور دروازے سے اس شخص کو اپنے کمرے میں داخل کیا، اپنے بستر پر اسے لٹایا اور خود کوٹھی سے نکل کر سڑک

کو عبور کر کے قائداعظمؒ کے مزار پر پہنچ گیا۔ تمام رات وہیں بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی غنودگی سی طاری ہو جاتی۔ صبح ہوئی تو مزار سے دوبارہ گھر آیا۔ دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے کس مہاجر بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: "اب تم یہاں سے کھسک جاؤ۔ صبح ہونے کو ہے، اگر تمہارے قیام کا کوئی بندوبست نہ ہو سکے تو رات کو پھر اسی طرح آ جانا اور خفیہ خفیہ اس بستر پر سو رہنا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے اُسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد عید آئی۔ میرے دولتمند بھائی صاحب نے اپنے کمرے میں اپنے بیٹے کو بلایا اور مجھے بھی بلایا۔ اور تاکید کی: "عید کی نماز میں تم دونوں میرے دائیں اور بائیں کھڑے ہونا۔" میں اس کا مطلب نہیں سمجھا مگر ان کے بیٹے نے مطلب سمجھا دیا۔ اُس نے بتایا کہ ابا نے تمام عمر نماز باجماعت میں اپنے دائیں بائیں دو آدمیوں کا بندوبست کیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی غریب یا پھٹیچر سا نمازی اُن کے ساتھ شانہ بشانہ نماز ادا کرے۔

اُن کے بیٹے نے مزید بتایا کہ اگر ابا کی موٹر کار خراب ہو جائے اور طویل عرصہ تک سڑک کے کنارے کھڑے رہنے کے باوجود ٹیکسی نہ ملے تو بھی وہ بس میں سفر نہیں کرتے خواہ خالی خالی سی بسیں اُن کے پاس کھڑی ہو کر گذرتی ہی رہیں۔

اُن کے بیٹے نے کہا: "ہو سکتا ہے کہ جس بس میں ابا سفر کریں اُسی میں ان کا چپراسی بھی سفر کر رہا ہو۔"

بھائی صاحب کے ہاں دو مہینے رہ کر میں لاہور آ گیا۔ چند سال بعد دوبارہ کراچی گیا۔ معلوم ہوا کہ بھائی صاحب نے کوئی پہاڑی خرید لی ہے۔ خیال یہ تھا کہ پہاڑی کھودنے سے مرمر کی سلیں نکلیں گی۔ مگر کھدائی کی گئی تو کوئی نہایت قیمتی دھات نکل آئی۔ اس دھات کی بڑی مانگ تھی اور اب بھائی صاحب بلاشبہ کروڑ پتی بن گئے تھے۔ مدینہ طیبہ میں روضۂ رسولؐ پر حاضری دینا اُن کے معمولات میں شامل تھا۔ جمعہ کی نماز وہ اسی انداز سے پڑھتے کہ دائیں بائیں اپنے گھر کے آدمیوں کو کھڑا کرتے کہ کہیں کوئی پھٹیچر نمازی شانے سے شانہ ملا کر نہ کھڑا ہو جائے۔ البتہ اُن کے عشقِ رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ جہاں اور جب بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اسمِ گرامی سنتے، آب دیدہ ہو جاتے۔ اور ذکرِ حبیبؐ سن کر چھکوں پھکوں رویا کرتے۔

مُلزم کا بیان

طلوع اسلام کے متعلق آپ کو عام طور پر بتایا جاتا ہے گا کہ یہ کہتا ہے کہ تین نمازیں پڑھو۔ نو دن کے روزے رکھو۔ سنت رسول اللہ کو مت مانو۔ سب حدیثوں کو دریا برد کر دو۔ اسلاف کی کوئی بات نہ مانو۔ وہ قرآن کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد آپ سے کہا جاتا ہے گا کہ طلوع اسلام والے ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے نہ ان کی کوئی بات سنو، نہ ان کا لٹریچر پڑھو۔

یہ الزامات بڑے سنگین ہیں اور اگر یہ سچے ہیں تو پھر آپ سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اس کے متعلق کچھ فیصلہ کریں، کیا یہ ضروری نہیں کہ آپ تحقیق کر لیں کہ کیا یہ الزامات واقعی سچے ہیں؟

(۲) حق سے میں سب سے پہلے بار ثبوت مدعی کے سر پر ہوتا ہے۔ اسلئے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو شخص آپ سے ایسی باتیں کہے اس سے کہیئے کہ وہ طلوع اسلام کی کوئی تحریر ایسی دکھائے جس میں یہ کچھ لکھا ہو جب تک وہ تحریر نہ دکھائے اس کی بات ہرگز نہ مانیئے۔

(۳) **اب آپ سنیئے طلوع اسلام کا بیان:** طلوع اسلام کا بیان یہ ہے کہ یہ تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی سچا نہیں۔ طلوع اسلام نے کبھی نہیں کہا کہ تین نمازیں پڑھو اور نو دن کے روزے رکھو۔ اسکے برعکس وہ مسلسل یہ کہتا چلا آرہا ہے کہ نماز روزے کے متعلق جس طرح امت میں ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کا حق کسی فرد کو حاصل نہیں۔ اس میں بالعموم ہر سال رمضان المبارک کے موقعہ پر روزوں کے قرآنی احکام شائع ہوتے ہیں جن میں بالتصریح لکھا ہوتا ہے کہ روزے پورے مہینے کے ہیں اور جو لوگ نو دن کے روزے بتاتے ہیں وہ قرآن کریم کے خلاف کہتے ہیں۔

(۴) طلوع اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سنت رسول اللہ کو نہ مانو اور سب حدیثوں کو دریا برد کر دو۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ حدیثوں کی کتابوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ جو حدیث قرآن کریم کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔

جو اس کے خلاف جاتی ہے وہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی غلط حدیثوں کو چھوڑ دو۔ اور صرف صحیح حدیثوں کو مانو۔

(۵) طلوع اسلام یہ بھی نہیں کہتا کہ اسلاف کی کوئی بات نہ مانو۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اسلاف کی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے اُسے قرآنِ کریم کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ جو بات اس کے مطابق ہو، اسے صحیح مانو۔ جو اس کے خلاف ہو اُسے چھوڑ دو۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارے بزرگوں نے قرآن شریف کو نہیں سمجھا تھا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر ایک کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے غور و فکر سے سوچ سمجھ کر پڑھے۔ اسلئے ہمیں قرآن شریف پر خود غور کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۶) طلوع اسلام کوئی نیا فرقہ نہیں بنانا چاہتا۔ فرقہ بنانا قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔

(۷) طلوع اسلام کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد، مکمل، اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اور اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے۔

طلوعِ اسلام چاہتا یہ ہے کہ:

جس طرح کی حکومت، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین نے قائم کی تھی، اسی قسم کی حکومت پاکستان میں قائم کی جائے۔ تاکہ ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی باطمینان پوری ہوتی رہیں۔ اور کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ ہر شخص سے عدل و انصاف ہو۔ اور قرآن شریف کے خلاف جس قدر قانون ہیں وہ سب منسوخ ہو جائیں اور قانون صرف خدا کا چلے۔ یہ بات ان لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جو خالص خدا کا قانون نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس سے ان کی ذاتی اغراض پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ طلوع اسلام کی مخالفت کرتے ہیں۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں ـــــ محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح بوقت ۹½ بجے بمقام ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ہوتا ہے۔ خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

باسمہ تعالیٰ

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟

طلوعِ اسلام جس قسم کا قرآنی معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اس میں :-

(۱) ہر شخص کی عزت، بلا تمیز مذہب، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔ اس کا کیریکٹر کیسا ہے اور وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کچھ کرتا ہے؟

(۲) کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی اور تکلیف رفع کی جائیگی۔ ہر شخص کو انصاف مفت ملیگا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملیگا۔ کوئی صاحبِ اثر، انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکیگا۔

(۳) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان وغیرہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۴) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت اور (بوقتِ ضرورت) علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا معاوضہ انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشاء حصولِ علم کے علاوہ، فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

٭ فرد میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور سفرِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے قابل۔

(۵) ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کرینگے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور کچھ لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(۶) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیگا۔

اور عند الضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے یہ سب کچھ قرآنی نظام کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

(۷) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) امت کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ قرآنی نظام انہیں نظم و نسق کی خاطر، بطور امانت افراد کے سپرد کرے گا۔

جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی۔ اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کیلئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(۸) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق۔ (اس میں گروہوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اسلئے اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(۹) ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا۔ اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(۱۰) یہ سب کچھ اسلئے ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے اٹل ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی انہی بنیادوں پر ہوگا۔

(۱۱) اس معاشرہ میں نظامِ حکومت کمیونزم کی ڈکٹیٹرشپ یا مغرب کی لادینی جمہوریت یا تھیاکریسی کے بجائے خالص قرآنی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اگر آپ بھی اس سے متفق ہوں تو اس کے لئے آپ طلوعِ اسلام سے تعاون کریں اور اس کے خلاف پھیلائے ہوئے غلط خیالات کو اہمیت نہ دیں۔ کیونکہ وہ جھوٹا پراپیگنڈہ ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

نقد و نظر

۱۔ وقائع زندگانی امِّ ہانی رضؓ

قوموں کے لئے تاریخ کی حیثیت وہی ہے جو ایک فرد کے لئے حافظہ کی ہے۔ جس طرح حافظہ کے گم ہو جانے سے ایک فرد اپنے تشخص سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے تو اس کا ملی تشخص ختم ہو جاتا ہے، یا محض افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کسی انسان کا حافظہ غلطی کرنے لگ جائے تو اسے جتنا نقصان وہ حافظہ پہنچاتا ہے، کوئی دوسرا شخص اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح جب کسی قوم کی تاریخ رطب یابس کا مجموعہ (بلکہ معجونِ مرکب) بن کر رہ جائے تو خود وہ تاریخ اس قوم کے لئے ہزار تباہیوں کا موجب بن جاتی ہے۔ ہم (مسلمانوں) کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری تاریخ عظیم روایات کی حامل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہی تاریخ بے شمار تضادات و خرافات سے بھری پڑی ہے۔ یہاں تک کہ ابن خلدون جیسا مؤرخ، جب تاریخ کا مقدمہ لکھتا ہے تو اس قدر شاندار کہ دنیا کی قومیں آج تک اسے سر آنکھوں پر اٹھائے پھرتی ہیں اور فلسفۂ تاریخ و عمرانیات کے موضوع پر اسے بے مثل کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہی ابن خلدون جب اصل کتاب (تاریخ) لکھتا ہے تو اس کی ابتداء (حضرت) آدم (علیہ) سے کرتا ہے۔ اور اس میں حسبِ معمول ایسے بے سروپا قصے لکھتا چلا جاتا ہے جن کی نہ کوئی سند ہے نہ ثبوت۔ اس قسم کی تاریخ، عام اقوام و ادوار کے متعلق بھی کچھ کم نقصان رساں نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس کا تعلق حضور رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ کے سے عہدِ ہمایوں سے ہو، تو اس میں اس قسم کے واقعات جس قدر مہلک نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ـــــ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر اس تاریخ کی حیثیت محض تاریخ کی سی سمجھی جاتی، تو مناسب تنقید و تہذیب سے اس میں سے بے بنیاد قصوں یا لغویات کو الگ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس تاریخ کو ایسا مقدس قرار دے دیا گیا کہ اس کی طرف تنقیدی نگاہ سے دیکھنا تک معصیت

سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ جیسی کچھ ہے اسی طرح آگے منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس پر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ وہ اور ثقہ اور منزہ عن الخطا بنتی جاتی ہیں۔

اندریں حالات، ایک مسلمان کے لئے اس تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالنا، کچھ کم ہمت طلب اور جرأت آزما مرحلہ نہیں۔ لیکن غنیمت ہے کہ ہمارے ہاں کبھی کبھی اس قسم کے "قلندر" پیدا ہو جاتے ہیں جو "بے خطر آگ میں" کود پڑتے ہیں۔ ہمارے دور میں اسی قسم کے ایک مرد بیباک، محمود احمد عباسی صاحب ہیں۔ انہوں نے بڑی جرأت اور ہمت سے ہمارے صدر اول کی تاریخ کو کنگھالنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، اور ان کی اس تنقید و تحقیق کے قابل قدر نتائج اس سے پہلے بھی ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی، زیر نظر کتاب کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہے۔ کتاب کے عنوان سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (حضرت) ام ہانی رضؓ کی زندگی میں ایسے واقعات کون سے ہو سکتے ہیں جو ایک ناقد تاریخ کی تحقیق کا موضوع بننے کے قابل ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں جس گوشے کی طرف عباسی صاحب کی نگہ کاوش گئی ہے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے واقعی اس قابل تھا کہ اس پر کھڑے ہو کر غور و فکر کیا جائے۔ نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں معراج کے واقعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قطع نظر اس کے کہ معراج کی اصل و حقیقت کیا تھی۔ اس کی تفاصیل میں جس قسم کے بے بنیاد قصے شامل ہو گئے ہیں اور تاریخی اعتبار سے ان میں جس قدر تضادات ہیں، ان سے اس کی اہمیت سخت مجروح ہو گئی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس واقعہ کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ معراج کی شب نبی اکرم (حضرت) ام ہانی رضؓ کے ہاں شب باش تھے۔ وہیں سے آپؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے اور وہیں واپس تشریف لائے۔ اور انہی سے آپؐ نے سب سے پہلے اس واقعہ کو بیان کیا۔ مؤرخین نے حضرت ام ہانی رضؓ کو حضورؐ کی زوجہ مطہرہ بتایا ہے۔

عباسی صاحب نے متعلقہ روایات کی تنقید و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ (حضرت) ام ہانی رضؓ سے متعلق یہ قصہ یکسر افسانہ ہے۔ اس لئے کہ

(۱) ام ہانی رضؓ حضورؐ کے چچا، ابو طالب کی بیٹی (اور حضرت علی رضؓ کی حقیقی بہن) تھیں۔ آپؐ نے (نبوت سے پہلے) اپنے چچا سے، ان کا رشتہ مانگا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اپنی بیٹی کو ہبیرہ کے نکاح میں دے دیا جو ابو جہل کا قریبی رشتہ دار تھا۔ یہ زمانہ معراج سے قریب بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے۔

(۲) زمانہ معراج میں، ام ہانی حالت کفر میں تھیں اور ہبیرہ کے نکاح میں۔ ہبیرہ اسلام کا سخت دشمن اور حضورؐ کا شدید مخالف تھا۔ اس کا گھر اسلام کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا۔

(۳) ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو ہبیرہ (اپنی کرتوتوں سے ڈر کر) مکہ سے بھاگ گیا اور اپنے

بیوی، بچوں کو بے سہارا چھوڑ گیا۔

(۴) ان حالات میں (حضرت) اُمِّ ہانیؓ نے اسلام قبول کیا لیکن باقی زندگی، نکاح ثانی کئے بغیر گزار دی اور سنہ ھ کے کچھ عرصہ بعد تک زندہ رہیں۔

اس سے آپ، اس افسانے کی حقیقت کا اندازہ لگا لیجئے جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت اُمِّ ہانیؓ حضورؐ کی زوجہ مطہرہ تھیں، اس لئے آپؐ ان کے ہاں شب باش تھے جب آپؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے۔

اس کے بعد عباسی صاحب نے اسی قبیل کی دیگر روایات کا اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ کی تاریخ کے سلسلہ میں ہمارا مسلک یہ ہے کہ اس کے لئے قرآن کریم کو معیار اور مسلک قرار دیا جائے۔ تاریخ کے واقعات کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے جو واقعہ اس معیار پر پورا اُترے اُسے تسلیم کر لیا جائے، جو اس کے خلاف جائے اُسے مسترد کر دیا جائے اور اس طرح اُس عہدِ سعادت مہد کی تاریخ کو ازسرِ نو مرتب کیا جائے۔

عباسی صاحب نے اپنی کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ وہ ایک کتاب "حیاتِ محمدؐ قبل از نبوت" کے موضوع پر تالیف کر رہے ہیں۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق، وہ کتاب بھی مرتب کریں۔ لیکن ہماری درخواست یہ ہے (اور اسے ہم پورے زور سے پیش کرتے ہیں) کہ وہ سیرت بعد از نبوت کی روایات کو بھی اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع قرار دیں اور اس کے بعد حضورؐ کی مکمل سیرتِ طیبہ کو پاکیزہ اور منزہ شکل میں ازسرِ نو مرتب فرما دیں۔ اگر وہ اس عظیم خدمت کو سرانجام دے سکے تو اس کا امت پر بھی احسان ہوگا اور ان کا خود اپنی ذات پر بھی احسان۔ کہ ان کے نامۂ اعمال میں اس سے زیادہ وزنی کوئی اور کارِ خیر نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے کہ وہ ہماری اس درخواست کو درخورِ اعتنا سمجھیں اور اللہ تعالیٰ انہیں اس خدمتِ جلیلہ کے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

زیرِ تبصرہ کتاب، تین روپے میں، مکتبہ علم و حکمت، سوتر منڈی۔ لاہور سے مل سکتی ہے۔

عباسی صاحب کا پتہ:- مکتبہ محمودیہ ۲۶/۱ - بی ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹ - ہے۔

——— (پیغ) ———

۲۔ اندلس ——— تاریخ و ادب

ہماری تاریخ کی اسی قسم کی ایک بوالعجبی زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی ہمارے سامنے آئی ہے۔ اندلس کو

مسلمانوں کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کے متعلق ہماری کتب تاریخ و ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کتاب کے مؤلف، ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب پروفیسر عربی، جامعہ کراچی نے عربی زبان کی اس قسم کی مشہور کتابوں سے ایسے اقتباسات اخذ کئے ہیں جن میں تاریخ کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ ان اقتباسات کی اصل (بزبانِ عربی) بھی شاملِ کتاب ہے اور ان کا اردو ترجمہ بھی۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر سا پس منظر بھی دے دیا گیا ہے تاکہ ان کا تاریخی تعارف بھی ہو جائے۔

اندلس پر مسلمانوں کے حملہ کا محرک واقعہ تاریخ میں عدیم النظیر اور موجبِ ہزار افتخار ہے۔ اندلس میں گاتھ حکومت کے زمانے میں دستور تھا کہ امراء، وزراء، گورنرز اور دیگر ممتاز اراکینِ مملکت کے لڑکے اور لڑکیاں بادشاہ کی خدمت میں رہتے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش اور تربیت کرتا اور جب وہ سنِ شعور کو پہنچتے تو اپنے والدین کے پاس واپس چلے جاتے۔ شاہ لرزیق ایک سن رسیدہ بادشاہ تھا، اور جو بچے اس کے زیرِ پرورش تھے ان میں ایک امیر (جولین) کی بیٹی (فلورنڈا) بھی تھی۔ لڑکی بڑی حسین تھی۔ جب وہ جوان ہو گئی تو اسے اپنے باپ کے پاس چلے جانا تھا لیکن بوڑھے بادشاہ کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے اُسے روک لیا اور جبراً اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دی۔ وہ بادشاہ کا محکوم اور کمزور تھا اس لئے اپنی اس بے عزتی کا بدلہ اس سے نہیں لے سکتا تھا۔ اسی زمانے میں موسیٰ بن نصیر (خلیفہ ولید کی جانب سے) قیروان کا گورنر تھا۔ جولین نے لرزیق کی چیرہ دستی کے خلاف موسیٰ سے فریاد کی اور انسانیت کے نام پر اس سے مدد چاہی۔ موسیٰ نے اس مظلوم کی فریاد پر لبیک کہا اور طارق کے زیرِ کمان فوج روانہ کر دی۔ طارق نے لرزیق کو شکست فاش دی اور یوں ایک (غیر مسلم) مظلوم باپ اور معصوم لڑکی کا انتقام لے لیا۔ یہ تھا اسپین پر طارق بن زیاد کے حملہ کا جذبہ محرکہ۔

اب سنیئے کہ اس سلسلہ میں زیرِ نظر کتاب میں کیا لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اسپین کی سرزمین پر اپنی فوجیں اتارنے کے بعد طارق نے اپنے مجاہدین کے سامنے جو تقریر کی، اس میں یہ کہہ کر انہیں جنگ کے لئے ابھارا تھا کہ

> یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے تھوڑا عرصہ تکلیفوں پر صبر کیا تو مدتوں عیش و آرام سے لطف اندوز ہو گے اور مزہ لو گے۔ ایسا نہ کرنا کہ سب اپنے لئے رکھ لو اور مجھے بھول جاؤ۔ اس میں تمہارا حصہ میرے حصے سے زیادہ نہیں ہو گا۔ تم جانتے ہو کہ اس جزیرہ میں کیسی حسین حوریں تخلیق ہوتی ہیں۔ دخترانِ یونان جو گوہر و مرجان کے ساتھ زربافت منبوسات میں محو خرام ہوتی ہیں اور تاجدار بادشاہوں کے محلات

میں پردہ کرتی ہیں۔ الولید بن عبدالملک امیر المومنین نے تم کو بہادروں کا نمونہ منتخب کیا ہے اور وہ خوش ہوں گے کہ تم اس جزیرہ کے بادشاہوں کے داماد اور بہنوئی بنو۔

غور فرمالیا آپ نے کہ مؤلف کتاب کے پیش کردہ اقتباس کی رُو سے، اندلس پر طارق کے حملہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا ــــ یونان کی گوہر و مرجان جیسی حسین حوریں ــــ !

لیکن ہماری قوم کی بھی عجیب حالت ہے۔ ہماری کتابیں اس قسم کی لغویات و خرافات سے بھری پڑی ہیں۔ جب کبھی کوئی مغربی مصنف ان کتابوں سے اخذ کردہ مواد اپنی کتابوں میں درج کرتا ہے تو ہم اس کے خلاف کہرام مچا دیتے ہیں اور حکومت پر زور ڈالتے ہیں کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔ اُس کتاب کے خلاف ہم شور مچا دیتے ہیں لیکن جو کتابیں ان خرافات کا سرچشمہ ہیں، ان کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس میں دن رات مصروف رہتے اور اسے دین کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ یا للعجب !

زیر نظر کتاب کی کتابت، طباعت عمدہ ہے۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت (مجلد) چھ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱

۳۔ مقالات ابن الہیثم

اگلے دنوں، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (پاکستان) کے زیر اہتمام، مشہور ماہر طبیعیات، ہیئت دان، ریاضی دان، طبیب، اور امام بصریات، حکیم ابن الہیثم کا ہزار سالہ جشن منایا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک سلسلۂ مطبوعات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جس کی پہلی کڑی زیر نظر تالیف کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں حکیم موصوف کے علم و تحقیق کے متعلق منتخب مقالات شامل کئے گئے ہیں۔ مقالات، بہ ہیئت مجموعی، عالمانہ ہیں اور موضوعات کے تنوع سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس محقق کی نگاہ کس قدر عمیق اور دائرہ تحقیق کس قدر وسیع تھا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن مستحق تبریک ہے کہ اس نے نہ صرف اس ہزار سالہ جشن سے حکیم موصوف کی عظمت سے قوم کو متعارف کرایا بلکہ ان مقالات کو شائع کر کے، اس کے علمی جواہر پاروں کو محفوظ بھی کر دیا۔ اور پھر انہیں شائع بھی اس رعنائی اور زیبائی کے ساتھ کیا جو اس محقق کی شایانِ شان تھا۔ اس قسم کی یادگاریں بے شک درخور تحسین و آفرین ہوتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ (جہاں یہ چیزیں ایک زندہ قوم میں، علمی تحقیق و تجسس کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہیں، وہاں) ایک

مائل یہ انحطاط قوم کے لئے افیون کا حکم رکھتی ہیں۔ زوال آمادہ اقوام کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ دیکھو! فلاں قوم نے فلاں میدان میں کس قدر ترقی کی ہے اور کس کس قسم کی ایجادات سے متاعِ انسانیت میں اضافہ کیا ہے، تو وہ ایک طنزیہ انداز میں کہہ دیتی ہیں کہ ان اقوام نے ایسا کچھ کرنے سے کونسا تیر مارا ہے۔ ہمارے اسلاف نے آج سے صدیوں پہلے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر کارنامے سرانجام دیئے تھے — وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتیں اور پھر کروٹ بدل کر سو جاتی ہیں۔ خدا کرے کہ ہمدرد فاؤنڈیشن کی یہ سعی و کاوش، ہمارے اربابِ علم و دانش کے لئے تحقیقات کی محرک ثابت ہوں، نہ کہ خود فریبی و خواب آوری کا موجب۔

یہ نہایت دیدہ زیب مجموعہ، ہمدرد فاؤنڈیشن۔ کراچی۔ سے آٹھ روپے میں مل سکتا ہے۔ لیکن اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کتاب، بلند پایہ علمی حلقہ کے مطالعہ کے لئے ہے۔ عوام کے لئے نہیں۔

بقیہ بزمِ مذاکرہ

صفحہ ۵۶ سے آگے

جو مسلمانوں کی مروجہ روایتی توہم پرستی سے مختلف نہ ہو۔ وہ اپنے ان فرسودہ تصورات کو ایک نظام اور ضابطۂ حیات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی اس قسم کی حرکات بھی ایک سنگِ گراں ہے جنہیں قرآن کی روشنی میں علم کے تیشے سے ہی پاش پاش کیا جا سکتا ہے اور اس جوئے شیر کو لانے کے لئے یعنی قرآنی احکام کو ضابطۂ حیات ثابت کرنے کے لئے ہر آن غور و فکر اور تسخیرِ فطرت کی سعی و کاوش کا عمل ہی اس سنگِ گراں کو راہ سے ہٹا سکتا ہے۔ اور یہی صراطِ مستقیم کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہی وہ رازِ حیات ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا: ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بزمِ مذاکرہ کے باقی مقالات طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔

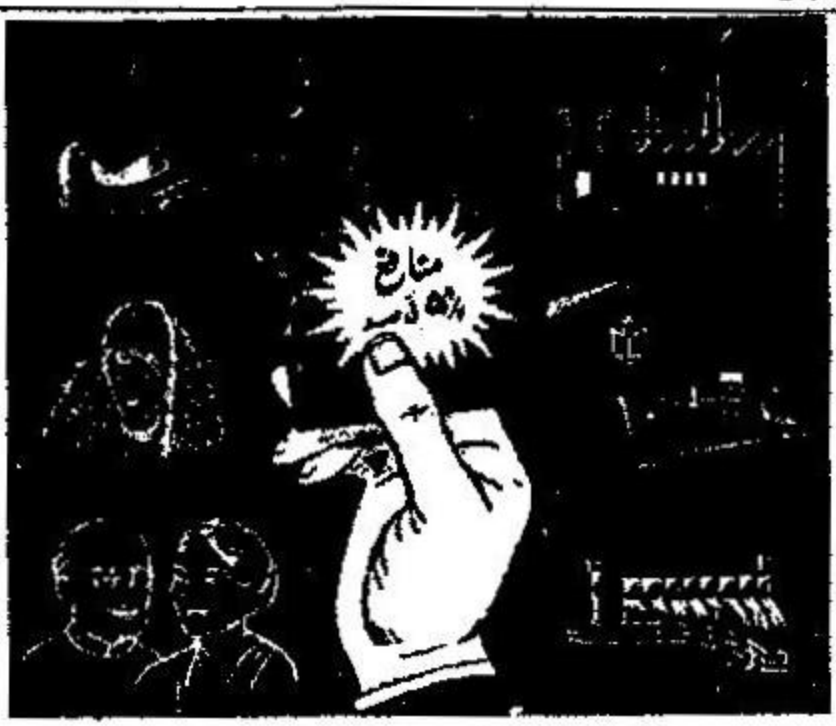

ایک پنتھ دو کاج

پوسٹ آفس سیونگ بینک میں بچت جمع کرانے سے آپ کو بھی فائدہ اور آپ کے ملک کو بھی فائدہ۔ ایک طرف تو آپ اپنی بچت اور اس کے منافع کی رقم سے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بہتر زندگی کے سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کی بچت تعمیری کاموں پر صرف ہوتی ہے ملک کے تعمیری اور تحقیقی ادارے ذرائع آمد و رفت اور چالنا بندرگاہ اور تربیلا بند جیسے عظیم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو سرمایہ لگایا جا رہا ہے اس میں وہ رقمیں بھی شامل ہیں جو آپ پوسٹ آفس سیونگ بینک میں جمع کراتے ہیں۔

پوسٹ آفس سیونگ بینک میں نفع بھی سب سے زیادہ ملتا ہے

منافع کی شرح

عام حسابات پر	۵½ فیصد
میعادی حسابات پر	
۶ ماہ یا زائد اور ۱۲ ماہ سے کم مدت کے لئے	۵¾ فیصد
۱۲ " " " ۲۴ " " " " " "	۶ " "
۲۴ " " " ۳۶ " " " " " "	۶½ " "
۳۶ " " " مدت کے لئے	۷ " "

پوسٹ آفس سیونگ بینک

مرنے کے بعد کیا ہوگا —

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

لیکن — اُسے جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

اس کا جواب ملیگا — ایک تازہ تصنیف

جہانِ فردا

سے جس میں — موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ قیامت۔
اعمال نامہ۔ جہنم۔ جنت وغیرہ — کی تفصیلات درج ہیں!

جلد حاصل کیجئے۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قیمت :- (اعلیٰ ایڈیشن) دس ۱۰/- روپے (جیبی ایڈیشن) چھ ۶/- روپے

ملنے کے پتے

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور: مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور